Regd. L. No. 7243 Phone, 808.

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1968

ہماری آزادی اور غلامی کا معیار

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کیلئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(قائداعظم محمد علی جناح)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

معراج انسانیت

پرویز

سیرتِ صاحبِ قرآن - خود قرآن کے آئینے میں
حُسنِ سیرت کی رعنائیاں - خالقِ حُسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رُو سے
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلّل اور مسکت جواب
- دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین

بارگاہِ رسالت مآبؐ میں

ایک انقلاب انگیز تصنیف ۔ ایک عہد آفریں کوشش ۔ عشق و خرد کا حسین امتزاج

بڑا سائز ۔ ضخامت قریب پانچسو صفحات ۔ کاغذ نہایت اعلیٰ ۔ جلد مضبوط ۔ گرد پوش جاذبِ نگاہ

قیمت ۔ بیس روپے Rs. 20/-

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

مکتبۂ دین و دانش - چوک اردو بازار - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ ـــ پاکستان ـــ دس روپے

سالانہ ـــ ہندوستان ـــ پندرہ روپے

سالانہ ـــ غیر ممالک ـــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ؛ ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون نمبر

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد (۲۱) | اگست۔ ۱۹۶۸ء | نمبر (۸)

فہرست

۱. لمعات ـــ ۲

۲. جشنِ آزادی (۱۹۶۸ء) ـــ ۱۵

۳. ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کا تبصرہ ـــ ۲۵

۴. شہریوں کی بے چارگی ـــ ۳۸

۵. روس کا عالمی کردار ـــ (محترم خورشید عالم صاحب) ـــ ۴۱

۶. سپاہی کی ذمہ داری ـــ ۴۸

۷. باب المراسلات ـــ (جمہوریت اور اقامتِ دین) ـــ (انشورنس) ـــ ۴۹

۸. ہماری تاریخ ـــ (علامہ تمنا عمادی مدظلہ) ـــ ۵۷

۹. حقائق و عبر ـــ (شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات) ـــ (قرعہ اندازی) ـــ (بیت المال) ـــ (بجا فرمایا آپ نے) ـــ (یہ بھی شریعت وہ بھی شریعت) ـــ (خالص دینی مقاصد) ـــ (کیا تمام مذاہب سچے ہیں؟) ـــ (خدا کا نام) ـــ (اسلام کا احیاء ہو رہا ہے) ـــ ۶۹/۸۰

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقامِ اشاعت ۲۵ بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ۔ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دیدہ ام مردے دریں قحط الرجال

دوسرے علاقوں کے متعلق تو یقینی طور پر کہا نہیں جا سکتا، لیکن آج سے کچھ عرصہ پہلے تک لاہور (اور اس کے گردونواح) میں حالت یہ تھی کہ کوئی پُرامن شہری، قانون شکن عناصر کے ہاتھوں اپنی کسی شے کو بھی محفوظ نہیں پاتا تھا۔ اور قانون کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ یہ سب کچھ کھلے بندوں، دن دہاڑے ہوتا تھا اور اس کی روک تھام کا کوئی انتظام نہ تھا۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اس بستے رستے شہر کے کسی بارونق بازار میں، سینکڑوں آدمیوں کی موجودگی میں، کوئی غنڈہ، کسی راہ چلنے کو پکڑ کر ذبح کر دیتا اور کسی میں اتنی جرأت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لے ـــ اس کا ہاتھ پکڑنا تو ایک طرف، سب لوگ بھاگ کر اِدھر اُدھر چھپ جاتے۔ دکانیں بند ہو جاتیں۔ اور قاتل دندناتا ہوا جہاں جی چاہے چلا جاتا۔ اور اس کے بعد بھی اس کے خلاف کچھ نہ ہوتا۔ شراب خواری، فحش کاری، قمار بازی وغیرہ کے اڈے عام کھلے تھے اور یوں نظر آتا تھا گویا اب ان کا ارتکاب جرم ہی نہیں رہا۔ بارے غنیمت ہے کہ پچھلے دنوں، اس عنصر کے خلاف ایک نہایت کامیاب مہم شروع ہوئی اور اب کیفیت یہ ہے کہ پُرامن شہری آرام سے سونے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ہم اربابِ متعلقہ کو ان کی اس حسنِ کارکردگی پر درخورِ تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں۔

لیکن جو کچھ اس سلسلہ میں کیا گیا وہ ہمارے نزدیک علاماتِ مرض کا علاج تھا علتِ مرض کا نہیں (وہ یوں سمجھئے کہ) جسدِ انسانیت پر ابھرنے والے پھوڑوں کی جراحی تھی، اُس فسادِ خون کی اصلاح نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ پھوڑے بنتے اور اُبھرتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں تفصیل سے لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ حسنِ اتفاق سے، ایک شام، لاہور ٹیلی ویژن پر، ایس۔ ایس۔ پی (سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس)، لاہور، مسٹر حبیب الرحمٰن خان کا ایک خطاب سننے کا موقعہ ملا۔ اور ہمیں بڑی مسرت اور اطمینان ہوا کہ انہوں نے قلتِ وقت کے باوجود

مختصر الفاظ میں، وہ سب کچھ کہہ دیا جسے ہم تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے۔ مسٹر حبیب الرحمٰن خان کی ایک قابل دیانتدار، فرض شناس، اور عدل پرور افسر کی حیثیت سے شہرت کا چرچا تو ایک عرصہ سے سننے میں آرہا تھا، لیکن ایک پبلک پلیٹ فارم سے (ہم ریڈیو یا ٹیلی ویژن کو پبلک پلیٹ فارم ہی شمار کرتے ہیں) انکے خیالات سننے کا اتفاق پہلی مرتبہ ہوا ۔۔۔ خیالات بلند اور پاکیزہ، بات دوٹوک لیکن نہایت شستہ، انداز صاف بتا رہا تھا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، محض رسمی اور تصنع نہیں بلکہ ایک ایسے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے جو صداقت سے لبریز اور جذبۂ اصلاحِ احوال سے معمور ہے۔ ہمیں اس احساس سے خوشی ہوئی کہ ۔۔۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں ۔۔۔ انہی لوگوں کی موجودگی ہے جو قوم کو مستقبل کی طرف سے یکسر مایوس نہیں ہونے دیتی۔

حبیب الرحمٰن خان صاحب نے، حالات پر تبصرہ اور جرائم کے محرکات کا تجزیہ کرنے کے بعد، دو بنیادی باتیں کہیں۔ اور وہی دو باتیں ہمارے نزدیک اس مرض کی علت ہیں۔ انہوں نے کہا کہ معاشرہ، پولیس کو موردِ الزام ٹھہرانے میں حق بجانب ہی، لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرہ پولیس کے لئے کرتا کیا ہے؟ ایک پولیس کانسٹیبل کو اتنے پیسے بھی نہیں ملتے جن سے اس کی اور اس کے بال بچوں کی دو وقت کی روٹی بھی چل سکے۔ آپ اسے رکھتے تو اس حال میں ہیں، اور پھر اس سے توقع یہ رکھتے ہیں کہ وہ دیانت و امانت کے بلند ترین معیار پر پورا اترے!

یہی وہ پہلی بات جو حبیب الرحمٰن خان صاحب نے ٹیلی ویژن پر کہی۔ اس کی ہم ذرا وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ اس محکمہ (پولیس) کے ملازمین کی تنخواہوں کے اسکیل کو سامنے لائیے۔

(۱) فٹ کانسٹیبل (سپاہی) ۔۔۔۔۔ (۹۰ ـ ۱ ـ ۷۵) (یعنی ۷۵/- روپے ماہوار سے آغاز۔ ایک روپیہ سالانہ ترقی اور ۹۰/- روپے معراج) سیلیکشن گریڈ میں ۳/- روپے زیادہ ملتے ہیں۔

(۲) ہیڈ کانسٹیبل ۔۔۔۔۔ (۹۵ ـ ۳ ـ ۱۲۵)

(۳) اسسٹنٹ سب انسپکٹر ۔۔۔۔۔ (۱۱۵ ـ ۵ ـ ۱۷۵)

(۴) سب انسپکٹر ۔۔۔۔۔ (۱۷۵ ـ ۱۰ ـ ۲۱۵/۱۵ ـ ۳۱۵)

یہ ہے ان کی تنخواہوں کا اسکیل۔ اگر ایک سپاہی کو رہائش کے لئے سرکاری کوارٹر مل جائے تو اس کی تنخواہ سے دو روپے ماہوار کرایہ کے وضع کر لئے جاتے ہیں۔ اور اگر سرکاری کوارٹر نہ ملے تو اسے دو روپے ماہوار بطور کرایہ ملتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کا مکان کرایہ پہ لے ("دو روپے ماہوار" کتابت کی غلطی نہیں۔ یہ سچ مچ دو ہی روپے ہیں)

مضافات میں انہیں یہی کچھ ملتا ہے۔ البتہ لاہور شہر کی گرانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے' دس روپیہ ماہوار زائد ملتے ہیں۔ یعنی ایک سپاہی کو' لاہور میں' کرایہ مکان سمیت' ۸۷/- روپے ماہوار ملتے ہیں۔ اس سے اس کی ابتداء ہوتی ہے اور ۱۰۲/- روپے ماہوار پر انتہا۔

سب انسپکٹر اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر اگر گھوڑا رکھیں تو اول الذکر کو ۴۵/- روپے اور ثانی الذکر کو ۲۵/- روپے ماہوار (گھوڑے کے اخراجات کے لئے) ملتے ہیں۔ یعنی' اسسٹنٹ سب انسپکٹر کو ایسا گھوڑا رکھنا ہو گا جس کا پیٹ' سب انسپکٹر کے گھوڑے سے آدھا ہو اور تیرہ چودہ آنہ روز میں بھر جاتے۔

انہیں' (جہاں تک ہمارے علم میں ہے) سال کے بعد' وردی میں ایک قمیص ملتی ہے --- ایک قمیص۔ اسی کو دھوئیے اور اسی کو پہنئے۔

ایک سپاہی' ایک مہینہ کے بعد' جیب - ۷۵/ روپے جیب میں ڈال کر تھانہ سے باہر نکلتا ہے تو صبح ہی صبح' سب سے پہلے اس کی نگاہ اس خاکروب پر پڑتی ہے جو سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ وہ باتوں ہی باتوں میں اس سے پوچھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاکروب کے کنبہ کی ماہوار آمدنی دو اڑھائی سو روپے سے کم نہیں۔ اور اکثر اوقات انہیں روٹی بھی مفت مل جاتی ہے۔ آگے بڑھتا ہے تو اسے سڑک کے کنارے' پیڑ کے نیچے' ایک موچی نظر آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ وہ شام تک آٹھ دس روپے کما لیتا ہے۔ پھر وہ ایک خوانچے والے کو دیکھتا ہے یا ایک سبزی فروش کو۔ ان کی کمائی بھی دس پندرہ روپے روز سے کم نہیں ہوتی --- غرضیکہ وہ صبح سے شام تک ایک ایک مزدوری پیشہ کے ساتھ اپنا مقابلہ کرتا ہے اور اپنے آپ کو سب سے پست سطح پر پاتا ہے۔ پھر جب اپنے اور ان کے کام کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کی ڈیوٹی ان سب سے زیادہ مشقت طلب اور ہمت آزما ہے --- مئی جون کی چلچلاتی دھوپ اور دسمبر جنوری کی راتوں کے کڑکڑاتے جاڑے میں' بارش کے سیلاب اور آندھی کے جھکڑ ہیں' دن ہو یا رات' اسے ہر وقت ڈیوٹی کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ اور ڈیوٹی وہ ہے جس میں آمنا سامنا خطرناک قسم کے مجرموں کا کرنا پڑتا ہے جو اکثر سنگین اسلحہ سے مسلح ہوتے ہیں۔ انہیں یہ ڈیوٹی سال کے ۳۶۵ دن (تیس سال تک) دینی پڑتی ہے۔ واقعی ۳۶۵ دن کیونکہ انہیں نہ اتوار کی چھٹی ہوتی ہے نہ عید --- بقر عید کی انہیں کوئی چھٹی نہیں ملتی۔

وہ جب ان تمام حالات پر غور کرتا ہے اور پھر ان بیوی بچوں کا تصور اس کے سامنے آتا ہے جنہیں اس ۷۵/- روپے کی رقم میں مہینہ بھر گذارہ بھی کرنا ہوتا ہے اور مستقبل کی فکر بھی' تو معاشرہ کے خلاف اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور یہ آگ ہنگامی نہیں ہوتی بلکہ یہ ہر روز تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے ایک سپاہی کی مالی حالت اور معاشرہ میں اس کی معیاری پوزیشن۔ اس کے برعکس، اس کے اختیارات کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ جس شخص کو جی چاہے گرفتار اور چوبیس گھنٹے (یا کم از کم رات بھر) کے لئے حوالات میں بند کر سکتا ہے۔ یہ وہ اختیار ہے جو سپریم کورٹ کے جج، حتیٰ کہ صدرِ مملکت کو بھی حاصل نہیں۔

آپ نفسیاتی طور پر دیکھئے کہ ایک شخص کے دل میں معاشرہ کے خلاف اس قدر انتقامی جذبات موجزن ہوں اور اس کے پاس اختیارات ہوں اس قدر وسیع، تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔

آپ اپنے دل سے پوچھئے کہ کیا اس کانسٹیبل سے (جس نے ۷۰/- روپے میں مکان بھی کرایہ پر لینا ہو، اور بال بچوں کا پیٹ بھی پالنا ہو) یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دیانتدار رہے؟ کیا ان حالات میں آپ دیانتدار رہ سکتے ہیں؟ ذرا سوچئے کہ کیا ہم نے اس سپاہی کو دانستہ اس "اضطراری حالت" میں نہیں رکھ چھوڑا جس میں قرآن کریم نے حرام تک کھا لینے کی اجازت دے دی ہے!

اور پھر سوچئے کہ جس معاشرہ نے اس کی یہ حالت کر رکھی ہو، کیا وہ اسے احترام کی نظروں سے دیکھ سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے اس معاشرہ کے ہر فرد کو ذلیل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا درآنحالیکہ اس کے پاس ایسا کرنے کے اختیارات بھی موجود ہوں۔

ہم اپنے ہاں کی پولیس میں کیڑے ڈالنے (یا انہیں نمایاں کرنے) کے لئے اکثر کہا کرتے ہیں کہ صاحب! انگلستان یا امریکہ کی پولیس اس قدر مہذب ہے کہ وہ کسی شریف آدمی کو ذلت کی نظروں سے نہیں دیکھتی۔ ان کا برتاؤ بڑا شریفانہ اور معاونانہ ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ میں ایک فٹ کانسٹیبل کی تنخواہ کیا ہے؟ وہاں ایک فٹ کانسٹیبل کو ۵۳۰۰/- ڈالر سالانہ ملتے ہیں۔ یعنی قریب ۲۲۰۰/- روپیہ ماہوار۔ اور اس کی تنخواہ میں اور پولیس کے اعلیٰ ترین افسر کی تنخواہ میں قریب ایک ہزار ڈالر سالانہ (یعنی قریب چار سو روپیہ ماہوار) کا فرق ہوتا ہے۔ پولیس کے اس سپاہی کی تنخواہ امریکہ کے فوجی کیپٹن کی تنخواہ سے زیادہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ پولیس کے ادنیٰ ترین سپاہی کو کیا (STATUS) دیتا ہے۔ دور کی بات چھوڑیئے اپنے ہمسایہ ملک ہندوستان میں پولیس کے سپاہی کی تنخواہ ۱۶۰/- روپے اور راشن مفت ہے۔ سوچئے کہ اس تنخواہ پانے والے سپاہی کے دل میں معاشرہ کے خلاف جذباتِ انتقام ابھر سکتے ہیں؟ اس کا دل معاشرہ کی طرف سے ہزار تشکر و امتنان کے جذبات لئے ہوتا ہے اور انہی کا مظاہرہ ان کے شریفانہ برتاؤ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ ہمارے ہاں پولیس کی تنخواہ اس لئے کم رکھی گئی ہے کہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ لوگ رشوت لیں گے۔ سوچئے کہ یہ منطق کس قدر غلط اندیشی اور نگاہ کی نامسلمانی پر مبنی ہے؟ یعنی یہ نہیں کہا جاتا کہ

وہ رشوت اس لئے لیتے ہیں کہ انہیں تنخواہ کم دی جاتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انہیں تنخواہ اس لئے کم دی جاتی ہے کہ وہ رشوت لیتے ہیں۔ آپ انہیں اس قدر دیجیے جو ان کی اور ان کے بال بچوں کی روزمرہ کی ضروریات اور مستقبل کی حفاظت کے لئے کافی ہو۔ اس کے بعد ان میں سے جو رشوت لے اسے پھانسی پر لٹکا دیجیے۔

قرآنی نظامِ معاشرہ کی اصلاح کے لئے اسی قسم کے اقدامات تجویز کرتا ہے۔ یہ جو ہم ہر وقت رونا روتے رہتے ہیں کہ معاشرہ میں رشوت عام ہو رہی ہے اور اس کے رکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، تو اس کا علاج بھی یہی ہے کہ عمالِ حکومت اور ان کے متعلقین کی جملہ ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی۔ اور ان کے اور ان کے بچوں کے مستقبل کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت اپنے سر لے، اور ذاتی جائیدادیں کھڑی کرنے کی قانوناً بندش کر دے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی بوالہوس رشوت لینے سے باز نہ آئے تو اس کی کھال ادھیڑ دیجیے۔

بہرحال، یہ تھی وہ پہلی بات جو محترم حبیب الرحمان خان نے پولیس کی اصلاح کے سلسلہ میں کی، اور ہم اس پر انہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے علاماتِ مرض کے علاج پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ علتِ مرض کی صحیح صحیح نشاندہی بھی کر دی ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے جو دوسری بات کہی، وہ پہلی بات سے بھی زیادہ اہم ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب میں نے غنڈوں کے خلاف مہم شروع کی تو مختلف گوشوں سے اس قسم کی آوازیں میرے کانوں میں پڑنے لگیں کہ پولیس پہلے تو خاموش بیٹھی منہ تکتے رہتی ہے اور جب معاملہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر پکڑ دھکڑ شروع کر دیتی ہے۔ اگر پولیس شروع ہی سے اپنی گرفت محکم رکھے تو غنڈے پیدا ہی نہ ہوں۔

انہوں نے کہا کہ جہاں تک پولیس کے واقعی تساہل یا تسامح کا تعلق ہے، میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ایسے واقعات بھی نوٹس میں آتے ہیں۔ میں اس کے ازالہ کی کوشش کروں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرہ میں غنڈے پیدا کون کرتا ہے؟ کیا اس کی ذمہ دار پولیس ہے یا خود معاشرہ! انہوں نے کہا کہ کوئی انسانی بچہ پیدائشی غنڈہ نہیں ہوتا۔ اسے معاشرہ غنڈہ بناتا ہے۔ گھر کا ابتدائی ماحول، تعلیم و تربیت، صحبت، گرد و پیش کے اثرات، معاشرہ کا عام چلن — یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک انسانی بچے کی سیرت مرتب ہوتی ہے۔ بچہ گندھی ہوئی مٹی ہوتا ہے۔ معاشرہ اسے جس قالب میں چاہے ڈھال لے۔ ہمارا معاشرہ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا کچھ خیال نہیں کرتا۔ نہ ہی یہ دیکھتا ہے کہ وہ کن لوگوں کی صحبت سے اثر پذیر ہو رہے ہیں۔ وہ کس ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں ایک بچہ (غلط تعلیم و تربیت اور غیر صالح ماحول سے) بتدریج غنڈہ بن رہا ہوتا ہے، اور معاشرہ اسے ایسا بننے دیتا ہے جب وہ اس طرح غنڈہ بن چکتا ہے تو معاشرہ پولیس کے سر الزام دھرتا ہے کہ ان کے تساہل یا تسامح کی وجہ سے غنڈہ گردی عام

ہو رہی ہے۔ اگر معاشرہ اپنے فرائض کو سرانجام دے اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے، تو نہ غنڈے اس کثرت سے پیدا ہوں اور نہ ہی غنڈہ گردی دبائی شکل اختیار کرے۔ اس کے بعد جو کہیں اِکّا دُکّا غنڈہ گردی کی واردات ہو تو پولیس اس کا بخوبی تدارک کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے میں ایک بچہ یا نوجوان سیرت اور ذہنیت کے اعتبار سے غنڈہ بن رہا ہوتا ہے، وہ (قانوناً) پولیس کی گرفت سے باہر ہوتا ہے۔ وہ پولیس کی گرفت میں اسی وقت آ سکتا ہے جب اس سے غنڈہ پن کا کوئی عملی مظاہرہ ہو۔ ایک شخص شریف شہریوں کیطرح قانونی حدود کی نگہداشت کرتے ہوئے شہر میں گھومتا پھرتا ہے لیکن دل میں نیت یہ رکھتا ہے کہ جہاں موقعہ پائے کسی کی چیز چرا لے۔ پولیس کا سپاہی اس شخص پر ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا جب تک اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے شبہ گزرے کہ اس کی نیت خراب ہے۔ "نیت کی اصلاح" پولیس یا قانون کی کوئی اور مشینری نہیں کر سکتی۔ یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت ہی سے ہو سکتی ہے جس کی ذمہ داری معاشرہ پر عاید ہوتی ہے۔

حبیب الرحمان صاحب نے یہ بات (وقت کی کمی وجہ سے) دو چار فقروں میں کہی تھی لیکن ان فقروں کے ارتکاز میں یہ تمام تفصیل سمٹی ہوئی تھی جسے ہم نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ وہ کس دقتِ نظر سے کام لے کر علتِ مرض کی گہرائی تک پہنچے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جرائم کی روک تھام معاشرہ ہی کر سکتا ہے۔ قانون تو ان مستثنیات (EXCEPTIONAL CASES) کے لئے کارفرما ہوتا ہے جو معاشرہ کی اصلاحی تدابیر کے باوجود ظہور میں آئیں۔ اور یہ مقصد صحیح تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم مستقل اقدار کی اہمیت پر جو اس قدر زور دیتا ہے، اس سے اس کا یہی مقصد ہے۔ جب تک یہ اقدار قوم کے نوجوان طبقہ کے دل کی گہرائیوں میں نہ اتریں، جرائم کی روک تھام نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ خدا (کا قانونِ مکافات) تمہاری نگاہ کی خیانتوں اور دل میں گذرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے، تو اس سے اس کا عملی مقصود یہی ہے کہ انسانی بچوں کی تعلیم و تربیت اس طرح کی جائے کہ اقدار شکنی کا خیال تک بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہو۔ اگر قوم کے قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا نہ ہو، تو پولیس (اور قانون) کی بڑی سے بڑی مشینری بھی جرائم کا انسداد نہیں کر سکتی۔ کوئی تین سال اُدھر کا ذکر ہے ریاستہائے متحدہ امریکہ نے (جرائم کے طوفانی شکل اختیار کر لینے کے پیشِ نظر) ایک اعلیٰ پیمانہ کا کمیشن متعین کیا تھا کہ وہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر گہری تحقیق کرے اور پھر بتائے کہ جرائم کی روک تھام کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ اس کمیشن نے اپنی انتھک کد و کاوش کے بعد ایک ضخیم رپورٹ مرتب کی جو بڑی تقطیع کے قریب ساڑھے تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ رپورٹ بڑی دلچسپ، معلومات افزا، سبق آموز اور عبرت انگیز ہے (اگر کبھی وقت ملا تو ہم اس کا تفصیلی تعارف قارئین سے کرائینگے)۔ اس رپورٹ میں (جس کا نام ہے

کے لئے بہت سی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ لیکن ان کے آخر میں کہا یہ گیا ہے کہ جرائم کے انسداد (THE CHALLENGE OF CRIME IN A FREE SOCIETY)

> آخر میں (ہم یہ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں) کہ کوئی نظام خواہ اس میں کتنا ہی عملہ کیوں نہ ہو، اور وہ منظم بھی کسقدر کیوں نہ ہو، اور ملک میں مادی آسائشیں بھی ہر ایک کے لئے کس قدر میسر کیوں نہ ہوں، یہ چیزیں معاشرہ کو جرائم سے پاک نہیں کر سکتیں تاوقتیکہ اس معاشرہ میں اخلاقی محرکات عام نہ ہوں۔ (ص۲)

یہ اس ملک کی حالت ہے جس میں (اس رپورٹ کے مطابق) جرائم کی انسداد کے لئے قریب ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر روزانہ خرچ ہوتے ہیں۔ وہاں کی قانونی اور نظم و نسق کی مشینری کی یہ بے بسی اس لئے ہے کہ ان کے ہاں وہ مستقل اقدار نہیں جن کے جزو ایمان بننے سے جرائم کی روک تھام ہو سکتی ہے۔ ان کا (اور اسی طرح یورپ کے تمام ممالک کا) نظریہ حیات مادی ہے۔ یعنی وہ نہ کسی مستقل قدر پر ایمان رکھتے ہیں، نہ ہی خدا کے اس قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین جو "نگاہ کی خیانتوں اور دل میں گزرنے والے خیالات" تک کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ مغربی ممالک کی یہ بے بسی قابلِ فہم ہے کہ ان کے ہاں یہ اقدار ہیں ہی نہیں۔ لیکن ہماری بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ ہمارے پاس ۔ اقدارِ خداوندی ۔ محفوظ شکل میں (قرآن کی دفتین میں) موجود ہیں، اور ان پر ایمان کا ہمیں زبانی دعوے بھی ہے۔ خود مملکت اپنے آئین میں اس کا اعتراف اور اعلان کر چکی ہے لیکن ہماری تعلیم گاہوں میں ان کا کہیں گزر نہیں۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ جس قوم کا ہم اس وقت اتنا رونا رو رہے ہیں، یہ کہیں مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو یا تو تشکیلِ پاکستان کے وقت پانچ سات برس کے تھے یا اس کے ایک آدھ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ اگر ہم ان کی تعلیم کا صحیح انتظام کرتے تو ہماری قوم آج دنیا کی بہترین قوم (خَیْرَ اُمَّۃ) ہوتی۔ ہم نے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ لیکن اب بھی بجائے اس کے کہ ہم اپنی غلطی کا اعتراف اور آئندہ کے لئے اس کے ازالہ کی تدابیر کریں، ہم کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کا الزام کسی اور کے سر دھر دیں۔ حبیب الرحمٰن خان صاحب نے یہی بات کہی تھی۔

---

۵ رجولائی کے اخبارات میں حبیب الرحمٰن خان صاحب کے ایک اور مستحسن اقدام کا ذکر آیا ہے۔ علاقہ کو دہشت پسند غنڈوں سے پاک کرنے کے بعد، وہ جوڈیشل جیل میں گئے جہاں بہت سے غنڈے زیرِ حراست ہیں۔ انہوں نے انہیں سمجھایا کہ قانون کا احترام کس قدر ضروری ہے اور قانون شکنی جہاں امن پسند شہریوں

کے لئے باعثِ پریشانی اور ہراسانی ہیں۔ وہاں اس کا انجام خود قانون شکنوں کے لئے بھی کس قدر عبرت آموز اور لرزہ انگیز ہے۔ ان کی ان نصائح کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریب ستر عنڈوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور وعدہ دیا کہ اگر انہیں موقعہ دیا جائے تو وہ عملاً ثابت کر دینگے کہ وہ کس قدر بُرامن شہری بن کر رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک کمیٹی کی تشکیل کر دی گئی ہے جو ان ملزموں کا جائزہ لے گی جن میں اصلاح کا امکان پایا جاتا ہے اور انہیں موقعہ بہم پہنچایا جائے گا کہ وہ عملاً اپنی اصلاح کر کے خود بھی عزت کی زندگی بسر کریں اور دوسروں کے لئے بھی نمونہ بنیں۔

حبیب الرحمٰن خان صاحب کا یہ اقدام بھی قرآن کریم کی تعلیم و منشار کے عین مطابق ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے انتظامیہ کا بنیادی مقصد غلط کار افراد کی اصلاح ہے۔ اگر یہ اصلاح سزا کے بغیر ہو سکتی ہے تو انہیں اس کا موقعہ دینا چاہیئے (اسی کو توبہ کہتے ہیں)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اثبات جرم کے بعد بھی مَنۡ تَابَ وَ اَصۡلَحَ کی گنجائش رکھی گئی ہے ـــــ یعنی جو اپنی غلط روش سے باز آجانے کا وعدہ کرے اور اس میں اصلاح کا امکان ہو تو اسے اس کا موقعہ دینا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجرموں میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو عادی جرائم پیشہ نہیں ہوتے بلکہ وہ کسی ہنگامی جذبہ سے مشتعل ہو کر ارتکابِ جرم کر بیٹھتے ہیں اور اس جذبہ کے فرو ہو جانے کے بعد، اپنے کئے پر نادم ہوتے ہیں۔ اگر انہیں اصلاح کا موقعہ دیا جائے تو وہ پھر پُرامن شہری بن سکتے ہیں۔ لیکن جب انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے تو سال چھ ماہ وہاں کی جرائم پیشہ سوسائٹی کے اثر سے ان میں سے ۹۹ فیصد پکے جرائم پیشہ بن کر باہر آتے ہیں۔ (قرآن کریم کی رُو سے عدل۔ جرم۔ سزا وغیرہ کے متعلق ہم تفصیل سے پھر کبھی بات کرینگے جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ پرویز صاحب کی کتاب "قرآنی قوانین" کا مطالعہ فرمالیں)۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ محترم حبیب الرحمٰن خانصاحب کا یہ اقدام بھی بڑا مستحسن ہے اور اس پر ہم انہیں مستحق مبارک باد سمجھتے ہیں۔ ان کی تقاریر، بیانات اور اقدامات سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی نگاہ بلند، قلب سلیم اور قرآنی مطالعہ عمیق ہے۔

ـــــــــــ (۰) ـــــــــــ

جوڈیشل جیل کے معائنہ کے بعد حبیب الرحمٰن خان صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ جیل کے حالات بڑے اصلاح طلب ہیں۔ اس میں زیرِ حراست ملزموں کے لئے زندگی کی آسائشیں تو ایک طرف بنیادی ضروریات تک پورا ہونے کا بھی تسلی بخش انتظام نہیں۔ ملزموں کے لئے جگہ کی قلت کی یہ حالت ہے کہ دس فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی کال کوٹھڑی میں ـــــ جس میں قیدِ تنہائی کا ایک مجرم محبوس کیا جاتا ہے ـــــ تین تین ملزم بند کئے جاتے ہیں۔ اس شدت کی گرمی میں ان پر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہاں

نہانے دھونے کے لئے تو ایک طرف، پینے کے لئے بھی پانی کا تسلی بخش انتظام نہیں۔ تعفن اس قدر ہے کہ انسان تو ایک طرف، اس میں حیوان بھی سانس نہیں لے سکتا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے ایک بعد کے بیان میں اس کی وضاحت کردی ہے کہ اس قدر ناگفتہ بہ حالات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گذشتہ دنوں کی (غنڈوں کے خلاف) مہم سے، زیرِ حراست ملزموں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، لیکن یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہم اصولاً کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم (حبیب الرحمٰن خان صاحب کے جائزہ اور وضاحتی بیان سے قطع نظر) اس سلسلہ میں عمومی نقطۂ نگاہ سے چند گذارشات ضروری سمجھتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ ایک شخص اپنے گھر میں (بال بچوں میں) اپنے معیار کے مطابق آرام سے بیٹھا ہے کہ اتنے میں اسے ایک شبہ کی بنا پر گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے — یہ حوالات کیا ہے؟ ایک کوٹھڑی، جس میں زندگی کی تمام ضروریات مفقود، اور ہر قسم کا سامانِ اذیت موجود ہوتا ہے۔ شدت کی گرمی میں، یہ کوٹھڑی بھٹی کی طرح تپتی ہے (اور سردی میں یخ خانہ کی طرح ٹھنڈی ہوتی ہے)۔ وہاں زمین پر دو چار بوسیدہ سے غلیظ اور کثیف کمبل جو قسم قسم کے جراثیم سے بھرے ہوتے ہیں، پڑے رہتے ہیں۔ اس میں نہ پینے کا پانی ہوتا ہے نہ ضروریات سے فراغت کے لئے کوئی الگ انتظام — وہیں ایک کونے میں کوئی ٹین سا رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ کوٹھڑی کتنے انسانوں کے لئے بنائی گئی تھی اور اس میں کتنے ٹھونس دیئے جاتے ہیں اس کا کوئی حساب و شمار ہی نہیں۔ ان میں سے کتنے، شدید قسم کے متعدی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کا بھی کسی کو خیال نہیں ہوتا۔

یہ ہے وہ کوٹھڑی جس میں اس انسان کو لا کر بند کر دیا جاتا ہے جسے ابھی ابھی زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ معلوم نہیں اسے کتنے دن اور کتنی راتیں اس میں بسر کرنی پڑتی ہیں کہ اس کے بعد عدالت اسے بے گناہ قرار دے کر بری کر دیتی ہے۔ آپ سوچئے کہ اس بے گناہ شریف آدمی کو جو اس قدر اذیت پہنچی، وہ کس جرم کی پاداش میں! یہ اذیت کس قدر شدید ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ (سنا گیا ہے کہ) کئی بے گناہ، ملزم، اقبالِ جرم کر لیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اذیت کے مقابلہ میں قید کی سزا کہیں بہتر ہوتی ہے — وہاں، قاعدے کی رو سے، اسے اور بی کلاس بھی مل جاتی ہے۔ لیکن حوالات میں سب ایک ہی کلاس میں ہوتے ہیں۔ بعض ملزموں کے متعلق جو دیکھا جاتا ہے کہ انہوں نے حوالات میں خودکشی کی کوشش کی، یا دروازے کی آہنی سلاخوں سے مار مار کر اپنا سر پھوڑ لیا، تو اس کی بیشتر وجہ وہ ناقابلِ برداشت اذیت ہوتی ہے جو انہیں حوالات میں پہنچتی ہے۔ اس سے ان کا دماغی توازن اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ وہ کبھی قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی کے دروازے اور کھڑکیاں توڑ پھوڑ دیتے ہیں، کبھی ہتھکڑیوں سے اپنے سپاہیوں پر حملہ کر دیتے ہیں، کبھی دوبارہ

کوٹھڑی میں داخل ہونے سے انکار کر کے سرکشی اختیار کر لیتے ہیں۔

اس حقیقت کو پھر ذہن میں رکھیئے کہ یہ ملزم ہیں ـــــ مجرم نہیں ہیں۔ ان میں سے کتنے وہ ہیں جو بے گناہ ہیں اور عدالت سے بری ہو جائیں گے۔ (واضح رہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر سو میں سے ستر ملزم عدالتوں سے بری قرار پاتے ہیں۔ یعنی ہر دس ملزموں میں سے جو ان کوٹھڑیوں میں بند ہوتے ہیں سات بے گناہ ہوتے ہیں اور باقی تین بھی وہ ہوتے ہیں جن کی سزا عدالت کے فیصلہ کے بعد شروع ہوتی ہے) ان بے گناہوں کو حوالات میں وہ سزا ملتی ہے جو مجرموں کو جیل میں بھی نہیں دی جاتی ـــــ آپ سوچیئے کہ یہ چیز (قرآن تو خیر بہت بلند ضابطۂ عدل ہے) عام عدل اور انسانیت کی رُو سے بھی کسی طرح جائز قرار پا سکتی ہے! قرآن کی تعلیم تو یہ ہے کہ جرم ثابت ہونے سے پہلے ہر شخص کو بے گناہ سمجھا جائے اور جس کے خلاف کوئی الزام لگے اس کے متعلق عام معاشرہ کا ردِّعمل (FIRST RE-ACTION) یہ ہونا چاہیئے کہ وہ کہیں کہ هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴/۱۲) اور هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶)، یعنی معاشرہ کو چاہیئے کہ اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لے اور کہے کہ یہ الزام بہتان نظر آتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قرآن کا تصورِ عدل، ملزم کے متعلق بدظنی سے کام لینے کی بھی اجازت نہ دیتا ہو وہ ملزم کو کسی قسم کی اذیت پہنچانے کی کس طرح بھی اجازت دے سکتا ہے؟ ہمارا یہ نظام جس میں ملزموں پر (ان کے مجرم ثابت ہونے سے پہلے ہی) یہ قیامت ٹوٹتی ہے یکسر خلافِ قرآن اور خلافِ تکریمِ انسانیت ہے جس کا خمیازہ معاشرہ کو بھگتنا پڑے گا ـــــ بھگتنا پڑے گا کیا؟ وہ ایک حد تک اس وقت بھی بھگت رہا ہے۔ جس بے گناہ پر حوالات میں یہ کچھ بیتتی ہے اس کے دل سے قانون اور عدل کا احترام اٹھ جاتا ہے اور اس کے سینے میں حکومت کے خلاف انتقام کے جذبات پرورش پانے لگ جاتے ہیں۔ معاشرہ میں ایسے افراد کا وجود، جو کل تک نہایت پُرامن شہری اور مملکت کے وفا شعار رعایا تھے، لیکن اب ان کا سینہ اس قسم کے جذبات کی آماجگاہ بن رہا ہے، معاشرہ کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں رکھتا۔

ہم اربابِ نظم و نسق سے گزارش کریں گے کہ وہ اس مسئلہ کو (جس قدر جلد ممکن ہو سکے) اپنی گہری توجہ کا مرکز قرار دیں۔ اس کے لئے ایک اعلیٰ اختیارات پر مشتمل کمیشن متعین کریں جس کے ارکان، حبیب الرحمٰن خان جیسے نگاہوں میں بصیرت، سینے میں استحکامِ پاکستان اور بہبودِ مملکت کا جذبہ، اور دل میں انسانیت کا درد رکھنے والے افراد ہوں۔ یہ کمیشن محض سفارشات مرتب نہ کرے بلکہ اپنی سفارشات اور تجاویز پر عمل کرانے کا ذمہ دار بھی ہو۔ ہمارے ذہن میں اس سلسلہ میں جو عملی تجاویز ہیں، انہیں ہم اس کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ اگر ہمارے موجودہ انتظام میں اطمینان بخش اصلاح ہو جائے تو آپ دیکھیئے گا کہ اس سے معاشرہ کی فضا پر کس قدر خوشگوار اثر پڑتا ہے ـــــ ہم حبیب الرحمٰن خانصاحب کے الفاظ دہرا دیں کہ "کوئی انسانی بچہ پیدائشی طور پر مجرم

نہیں ہوتا۔ اسے معاشرہ مجرم بنا دیتا ہے" اور شریف انسانوں کو مجرم بنانے میں ہمارے موجودہ تفتیشی، حوالاتی (اور قید خانی) نظام کا بڑا دخل ہے۔

---(۰)---

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ۷ جولائی کی شام 'ریڈیو پاکستان (لاہور) کے دیہاتی پروگرام سے جبیب الرحمن خانصاحب کی ایک تقریر سننے میں آئی۔ (چونکہ انہوں نے لاہور شہر سے غنڈہ گردی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ نواح لاہور میں بھی (اپنے حلقہ کے اندر) ان کا صفایا کر دیا ہے۔ اس لئے ان دیہات میں بھی ان کی آواز بڑے احترام سے سنی جاتی ہے۔) اس تقریر میں (جو نہایت مختصر اور پنجابی زبان میں تھی) انہوں نے دو باتیں ایسی کہیں جو (کم از کم) ہم نے اس سے پہلے کسی سرکاری افسر سے نہیں سنیں لیکن جنہیں سرکاری افسروں کی زبان سے سننے کو بہت جی چاہتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ پولیس نے غنڈوں کا تو خاتمہ کر دیا لیکن چوری چکاری کی وارداتیں تو ابھی تک ہو رہی ہیں۔ اس کے جواب میں جبیب صاحب نے جو کچھ کہا وہ نہایت غور سے سننے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس قسم کی وارداتوں کا بالکلیہ روک دینا کسی کے بس کی بھی بات نہیں۔ یہ غلط معاشرہ کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور اس کا علاج صرف صحیح معاشرہ کا قیام ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس معاشرہ میں لوگ اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم رہیں' اس میں اس قسم کی وارداتیں لابدی ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ دیکھئے کہ ایک شخص مزدوری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور اسے مزدوری نہیں مل رہی۔ یا وہ کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گیا ہے اور وہ دو دن سے بھوکا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں کوئی مقام ایسا نہیں جہاں سے اس شخص کو روٹی مل سکے۔ اب اس کے لئے ایک ہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرے اور جیل خانے چلا جائے۔ وہاں اسے تمام ضروریات زندگی مل جائیں گی۔ سو جس معاشرہ میں مجرم کو تو ضروریات زندگی میسر ہوں لیکن پُرامن شہری کے لئے ان کا کوئی ذمہ دارانہ انتظام نہ ہو، اس میں' اس قسم کی وارداتوں کا انسداد کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیز تو معاشرہ میں تبدیلی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جبیب الرحمن خان صاحب نے کس قدر گہری نگاہ سے علتِ مرض کی تشخیص کی ہے' اور کیسی بالغ نظری سے اس کا علاج سوچا ہے! اس سے یہ بھی واضح ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کا کس وقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے کیونکہ اس قسم کے صحیح نتائج تک قرآنی بصیرت ہی پہنچا سکتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے جو فرمایا تھا کہ "محتاجی انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے" تو اس سے یہی مراد تھی۔ اس قسم کی معاشی تبدیلی کے بغیر معاشرہ سے اس قسم کے جرائم مٹ نہیں سکتے۔

اگلی بات جبیب صاحب نے یہ کہی کہ مجرم کے لئے بدنی سزا ہی سب سے زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے۔ قید

کی سزا کا اس پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔ قید کی سزا مجرم کے لئے سزا نہیں بلکہ اس کے متعلقین کے لئے سزا ہوتی ہے۔ ایک مزدور کو آپ (کسی جرم کی پاداش میں) چھ ماہ کی قید کی سزا دے دیتے ہیں۔ وہ جیل خانہ میں مزدوری کرتا اور کھاتا پیتا ہے۔ لیکن اس کے بیوی بچے جن کی روزی کا یہ واحد ذریعہ تھا، بھوکوں مرجاتے ہیں اور معاشرہ میں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا (بلکہ ان بے گناہوں کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے) سوال یہ ہے کہ ان بیچاروں کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بدنی سزائیں تجویز کی ہیں۔ قید کو بطور سزا تجویز ہی نہیں کیا۔

(۰)

طلوع اسلام نے شخصیتوں سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ اس کا تعلق زندگی کے اصولوں سے ہوتا ہے ہم نے اس وقت بھی جو کچھ لکھا ہے اس میں اگرچہ ایک شخصیت (حبیب الرحمٰن خان صاحب) محوری حیثیت رکھتی ہے لیکن ہم نے یہ کچھ ان کی شخصی حیثیت کے پیش نظر نہیں لکھا۔ ہماری گفتگو اصولی ہے اور ان صاحب کا نام اس لئے درمیان میں آگیا ہے کہ ان اصولوں کی کارفرمائی ان کی زبان اور عمل سے ہوئی ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اسکا ملخص یہ ہے کہ:

(۱) اگر آپ پولیس کے عملہ (یا کسی اور سرکاری عملہ) کو دیانتدار اور حسن کار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ انہیں اتنا دیں جس سے ان کی اور ان کے متعلقین کی ضروریات زندگی باعزت اور اطمینان بخش طریق سے پوری ہوسکیں اور وہ اپنے مستقبل کی طرف سے بھی مطمئن ہوں۔

(۲) غنڈے اور دیگر ناقابل شکن عناصر غلط تعلیم، تربیت، ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان عناصر کی پیداوار کو روکنے کی ذمہ داری معاشرہ پر عاید ہوتی ہے۔ یہ عنصر پولیس کے سامنے اس وقت آتا ہے جب وہ غنڈہ بن چکا ہوتا ہے۔ اس کی روک تھام صحیح تعلیم و تربیت اور سعید ماحول سے ہوسکتی ہے۔

(۳) جرائم کے انسداد کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ میں ایسی معاشی تبدیلی کی جائے جس سے کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہنے پائے۔

(۴) مجرمین کو قید کی سزا کے بجائے بدنی سزا دی جائے۔ اور اگر بعض حالات میں کسی مجرم کو محبوس رکھنا ناگزیر ہو تو اس کے اُن متعلقین کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا انتظام کیا جائے جن کے لئے روٹی کمانے کا وہ واحد ذریعہ تھا ـــــ اور

(۵) جب تک عدالت کی طرف سے کسی ملزم کو مجرم قرار دے کر سزا نہ ملے اسے حوالات یا جوڈیشل جیل میں ایسی حالت میں ہرگز نہ رکھا جائے جس سے اسے اذیت پہنچے یا اس کے شرفِ انسانیت کی تذلیل ہو۔ ملزموں

کو کسی صورت میں بھی انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

آپ سوچئے کہ یہ جائزہ اور تجاویز کس قدر مبنی بر حقیقت ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ محترم حبیب الرحمٰن خانصاحب نے اپنے اس جائزہ سے ملکت کے عوام ہی کی قابل قدر خدمت سرانجام نہیں دی بلکہ خود ملکت سے بھی اپنی وفاشعاری اور بہی خواہی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے کہ ملکت کا حقیقی بہی خواہ وہی ہو سکتا ہے جو ان اسباب و عوامل کی صحیح صحیح تشخیص کرے جو عوام کے دل میں حکومت کے خلاف نفرت و انتقام یا عام مایوسی اور بددلی کے جذبات بیدار کرنے کا موجب ہوں۔ اور پھر ان کے ازالہ کے لئے ممکن العمل تجاویز بھی پیش کرے۔

ہم (اور ہمارے ساتھ ملکت کے جملہ بہی خواہ اور انسانیت کے ہمدرد) انتظار کریں گے کہ حکومت حبیب الرحمٰن خان صاحب کی ان تجاویز کے سلسلہ میں کیا عملی اقدامات کرتی ہے اور حبیب صاحب سے درخواست کرینگے کہ وہ اپنے اس قسم کے خیالات و تجاویز سے وقتاً فوقتاً قوم کو مستفید فرماتے رہیں ـــ یہ ان کی بہت بڑی ملی خدمت ہوگی۔

(بقیہ)

ISLAM:

A CHALLENGE TO RELIGION

پروفیسر صاحب کی اس انقلاب انگیز، عہد آفریں کتاب کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ وہ پریس میں جا چکی ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گی۔ لیکن طباعت کی دشواریوں کی وجہ سے وہ ابھی تک مکمل نہیں ہو سکی۔ ویسے بھی ہم چاہتے ہیں کہ جس پایہ کی یہ کتاب ہے، اس کی طباعت بھی اسی کے مطابق ہو۔ اس سلسلہ میں پریس (زریں آرٹ پریس) ہم سے پورا پورا تعاون کر رہا ہے جس کے لئے ہم اس کے شکر گذار ہیں۔ چونکہ اس کتاب کے متعلق ہمیں پاکستان اور بیرونی ممالک سے پیہم استفسارات موصول ہو رہے ہیں اس لئے ہم نے اس اطلاع کا شائع کرنا ضروری سمجھا ہے ـــ ہمیں امید ہے کہ کتاب اگست کے وسط نہیں تو اخیر تک چھپ جائے گی۔ احباب سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ انہیں اس قدر زحمت کش انتظار ہونا پڑا۔ کتاب ہے ہی ایسی جس کا بے تابی سے انتظار کیا جائے۔

یہ کتاب فکر کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دے گی اور اسلام کو اس انداز میں پیش کرے گی جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ انسانیت کا مستقبل اسی ضابطۂ زندگی سے وابستہ ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور

یہ آج سے بیس سال قبل کی بات ہے!

جشنِ آزادی ۱۹۴۸ء

تشکیلِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ وہ ہر سال جشنِ آزادی (۱۴ اگست) کی تقریب پر ایک خصوصی مقالہ میں ملی جائزہ لیا کرتا تھا اور اس احتسابِ خویش سے قوم کو بتایا کرتا تھا کہ ہم نے اس ایک سال میں کیا کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں اس نے جشنِ آزادی (۱۹۴۸ء) کی تقریب پر جو جائزہ لیا تھا، اسے آئندہ صفحات میں بجنسہٖ پیش کیا جاتا ہے، اس مقصد کے ساتھ کہ ہم اس آئینے میں اپنے خط و خال دیکھیں اور اس امر کا جائزہ لیں کہ آج ٹھیک بیس سال بعد ہماری حالت کیا ہے۔

اس جائزہ کا آغاز

نذرِ عقیدت

سے کیا گیا تھا جو درج ذیل ہے۔

"بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۳۰ء تک مسلمانانِ ہند کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں اِدھر سے اُدھر اڑا لیجاتا۔ پانی کی رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ قوم نہیں ایک ناقہ تھی بے زمام، ایک کارواں تھا بے منزل و بے سالار، ان کی سعی و عمل بگولے کے رقص اور سمندر کی لہروں سے زیادہ نتیجہ خیز نہ تھی کہ اس محشرستانِ تشتت و انتشار میں اللہ کا ایک بندہ اٹھا جسے سیدِ فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کیساتھ دانشِ نورانی کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز کیا تھا۔ اس نے قافلے کے منتشر افراد کو للکارا اور کہا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ قرآن نے تمہاری منزل کونسی مقرر کی ہے اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کون سی راہ سیدھی ہے۔ اس نے گردوپیش کے حالات کا تجزیہ کیا اور الٰہ آباد کے مقام پر کھلے اور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

> شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء، علامہ اقبال علیہ الرحمۃ)

پھر اس کی نگہٗ دوررس ایک ایسے صاحبِ فراست و اخلاص کی متلاشی ہوئی جو ملتِ اسلامیہ کی اس متاعِ بردہ کی بازیافت کے لئے مقدمہ لڑے اور قوم کو راہ میں فروخت ہی نہ کر دے۔ ۱۹۳۶ء میں اس نے یہ دستاویز ایک ایسے آزمودہ کار، صاحبِ دیانت و اخلاص وکیل کے ہاتھوں میں دے دی جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ دنیا نے اسے محمد علی جناح اور ملت نے قائدِ اعظم کہہ کر پکارا۔ (علیہ الرحمۃ)۔

اس نحیف و ناتواں رہبر نے جس تدبر و فراست اور اخلاص و دیانت سے اس مقدمہ کو لڑا، دنیا کی عدالتیں اس پر متعجب و حیران ہیں۔ اللہ نے اس کے حسنِ نیت کو نتائجِ کامرانی سے نوازا اور اگست ۱۹۴۷ء میں وہ قوم کے حق میں ڈگری لے کر احاطۂ عدالت سے باہر آیا۔

ملتِ اسلامیہ اس مفکرِ اعظمؒ اور اس قائدِ اعظمؒ کی بارگاہِ عالیہ میں حسنِ عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے کا فخر حاصل کرتی ہے۔"

(۰)

اس کے بعد احتسابِ خویش پر مشتمل جائزہ ملاحظہ فرمائیے۔

جشنِ آزادی ۱۹۴۸ء

"انسانی تاریخ کے اوراق پیچھے کو اُلٹتے جائیے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے غاروں تک کے ازمنۂ مظلمہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خط کے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے، طرزِ بود و ماند بدلے گا، اسلوبِ رفتار و گفتار بدلے گا، لیکن اعصار و دہور کے اس تضاد و تباین اور امصار و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور، بلا تخصیص زمان و مکان

آزادی کی دیوی

ہمیشہ سر دھا کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی ایک دور میں بھی ایسا گروہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جد و جہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نماردہ و فراعنۂ زماں اور اکاسرہ و قیاصرۂ دہر ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کمزور انسانوں کے سینے سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹنا اور مٹنا

گوارا کرلیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ اس نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگ مسلسل پر ان گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر ساتھ لے گئیں لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ و تاز کے باوجود کبھی نہ مٹ سکا تو وہ اُس بطلِ جلیل کے نام کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی یا پھر اُس باعثِ ننگِ انسانیت کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ بہرحال دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے ناپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے، بایں نمط کہ آزادی دنیا کے ہر لغت میں شرف و مجدِ انسانیت کے مرادف اور غلامی، ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی بالآخر ہے کیا، جو انسان کے لئے اس درجہ مرغوب و مقصود بن چکی ہے۔ اگر وہ یہی آزادی ہے جس کا

آزادی سے مراد کیا ہے

غلغلہ ہم بھی ایک سال سے سن رہے ہیں تو ہمیں حیرت ہے کہ انسان کو کیا ہوگیا کہ اس نے اس کی خاطر زمین اور آسمان کو ایک کر رکھا ہے۔

ہم گذشتہ ایک سال سے آزاد ہیں۔ پچھلے سال بھی ۱۵/ اگست کو ہم نے آزادی کا جشن منایا۔ آج ایک سال بعد پھر ویسا ہی جشنِ آزادی منا رہے ہیں۔ آزادی کا یہ تہوار اب ہر سال منایا جایا کرے گا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے اس ظاہری شور و غوغا اور سطحی دھوم دھام کے ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ ہم وہی کچھ

ہماری آزادی

ہیں جو ۱۵/ اگست ۴۷ء سے پہلے تھے۔ ہم وہیں ہیں جہاں اس تاریخِ آزادی کے وقت تھے۔ بلکہ ایک لحاظ سے اُس سے بھی کچھ پیچھے۔ ہم اب آزاد ہیں۔ قانونی اور آئینی معنوں میں پوری طرح آزاد۔ لیکن کیا آزادی کے نتائج یہی کچھ ہوتے ہیں جن سے ہم دوچار ہیں؟ کیا یہی وہ آزادی ہے جس کے نغمے فطرتِ انسانی کے ساز سے ہمیشہ ابھرتے، اُبلتے رہتے ہیں؟ کیا ہم خود اسی آزادی کا مطالبہ کیا کرتے تھے؟ اگر آزادی اسی کیفیت (بلکہ عدمِ کیفیت) کا نام ہے تو ہمیں اعتراف کر لینا چاہئے کہ تاریخ کی ریگ رواں کے تمام نقوش باطل ہیں یا ہم ہی نے کہیں دھوکا کھایا ہے۔

کہنے کو ہم آزاد ہیں، ہر معنی میں آزاد لیکن ہمیں سال بھر میں ایک مرتبہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ اس آزادی نے ہم میں کونسی تبدیلی پیدا کی کہ جس کے باعث ہم اس آزادی کی زندگی کو سابقہ غلامی کی زندگی پر ترجیح دیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس آئینی آزادی میں کسی ایسی شے کی کمی ہے جس سے آزادی اور غلامی میں چنداں امتیاز نظر نہیں آتا۔ آیئے دیکھیں کہ "سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے" کے مصداق کون "تو" ہم میں نہیں۔ آیئے دیکھیں کہ اس ہیملٹ کی داستان میں وہ کون سا شہزادہ گم ہے جس سے یہ داستان اس درجہ بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔

۱۹۳۱ء کی مسلم کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں اس امر کا ذکر کرتے ہوئے کہ اربابِ کانفرنس نے

ایک مفکر (VISIONARY) کو صدارت کے لئے چنا ہے علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ

قومیں فکر سے محروم ہو کر برباد ہو جاتی ہیں!

فکر سے محرومی

آج ہماری یہی کیفیت ہے۔ ہم سیاسی آزادی سے تو ہمکنار ہو چکے ہیں لیکن فکر سے محروم اور تہی ہیں۔ آزادی، غیروں کی غلامی (سیاسی استیلاء) کی عدم موجودگی کی سلبی کیفیت کا نام نہیں۔ آزادی ایک مثبت شے ہے۔ یہ تنہا لَآ اِلٰہَ کی وادی میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ کلمۂ اِلَّا اللّٰہ کی دائمی بہار ہے۔ آزادی ظلمت نہیں کہ عدمِ نور کا نام ہو بلکہ یہ نور کی مثبت موجودگی ہے کہ جس سے زندگی کا ہر گوشہ صدخا و بداماں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی خارج سے مسلط نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کا فوارہ اعماقِ قلوب سے پھوٹتا ہے۔ یہ اس وقت تک مثبت کیفیت نہیں بنتی جب تک کہ "ما بانفسہم" کے تغیر و تبدل کی آئینہ دار نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں صلاحیت کے بغیر مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ اسی لئے خدا کا یہ بخشیدہ بہشت "ہیچ" معلوم ہوتا ہے[1]۔ اور یہ ہیچ ہی معلوم ہوتا رہیگا جب تک یہ موہبتِ الٰہی اس مقصد کے لئے استعمال نہ ہو جس کے لئے یہ عطا ہوئی ہے۔ اس کا ایسا استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارا پیش نہاد کیا ہے اور وہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ فریضہ صاحبِ فکر کا ہے اور ہماری بدبختی یہ ہے کہ

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

ہماری سابقہ سیاست

ہندی سیاست کا ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا عشرہ ہمہ گیر نقص اور ہیچ و تاب کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک عام ہیجان و طوفان تو ضرور تھا لیکن اعمال باطل ہو رہے تھے اور ان کا کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ قوم ایسا تخم بو رہی تھی جس کا کچھ حاصل نہ تھا۔ وہ اس راہ پر چل رہی تھی جس کی کوئی منزل نہ تھی۔ عین اس حال میں ایک صاحبِ فکر نے قوم کو ایک تصور دیا۔ وہ تصور شاعر کا

"شاعر" کا تصور

خواب اور مجذوب کی بڑ معلوم دیتا تھا لیکن اس میں جادو تھا۔ اس نے قوم کو قوم بنا دیا۔ بکھرے دانوں کو ایک تسبیح میں پرو دیا۔ دس کروڑ کے ہجوم کو ملتِ واحدہ بنا کر ایک جھنڈے، ایک پلیٹ فارم اور ایک لیڈر سے وابستہ کر دیا۔ انتشار میں مرکزیت پیدا ہو گئی۔ باطل اعمال نتیجہ خیز ہونے شروع ہو گئے اور ائتلاف کی وہ نعمت میسر آنے لگی جو قرآن کے الفاظ میں، دنیا بھر کے خزانوں کے

---

[1] آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ — تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست (اقبالؒ)

عوض بھی میسر نہ آسکتی تھی۔

وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۸/۶۳)

اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہم ائتلاف پیدا کر دیا۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین پر ہے جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا۔ لیکن یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ وہ (اپنے کاموں میں) غالب اور حکمت والا ہے۔

ائتلاف، وحدتِ مقصد و وحدتِ منزل سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مقصد و منزل متعین ہو گئے تو قوم کی ہر حرکت اس متعین منزل کی جانب ہو گئی۔ ملت نے بالآخر اس منزل کو پا لیا لیکن پس چہ؟ وہ منزل مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک خوب تر منزل کا سنگِ میل ہے۔

ہندو اور مسلمان میں فرق

تقسیمِ ہند سے ایک طرف ہندو نے آزادی حاصل کر لی ہے اور دوسری طرف مسلمان نے ایک قطعۂ ارض حاصل کر لیا ہے۔ ہندو کے نزدیک تصورِ آزادی محض یہ تھا کہ بدیشی راج باقی نہ رہے اور کاروبارِ حکومت دیسیوں، ملکیوں (ہندوؤں) کے ہاتھ میں آجائے۔ یہ اس کی منزلِ مقصود تھی۔ اب جب وہ یہاں تک پہنچ گیا ہے تو وہ مطمئن ہے کہ وہ آزاد ہو گیا۔ لیکن مسلمان کی حالت مختلف ہے۔ یہ اس موجودہ آزادی کو منزل نہیں تصور کرتا۔ اس کے نزدیک یہ آزادی نشانِ منزل ہے۔ لیکن اب وہ کشمکش میں مبتلا ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اسکے تحت الشعور میں ایک خلش ہے، مبہم خلش جس کا علاج اسے میسر نہیں۔ وہ دنیاوی (سیکولر) حکومت قائم کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کہ پاکستان کو اس نے نظامِ قرآن رائج کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اگر نظامِ

ایک کشمکش

قرآن رائج کرنے کی طرف آتا ہے تو اسے معلوم نہیں کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ قوم ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔ نظامِ قرآن کا خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو رہا ہے۔ ماضی کے مخصوص حالات نے مُلّا کو مذہب کا خصوصی اجارہ دار بنا دیا ہے۔ مُلّا اسلام و قرآن کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ رجعت پسندانہ، دقیانوسی اور ناقابلِ قبول و ناممکن العمل ہے۔ اسکے اپنے مقاصد ہیں جن کا وہ تحفظ چاہتا ہے۔ زکوٰۃ، خیرات کی مدات اس کی تحویل میں دے دی جائیں تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ مذہب کی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن یہ مذہب چند رسوم کا نام ہے غیر مذہبی امور کے لئے "دنیاوی حکومت" لازمی ہے۔ دنیاوی حکومت کی زمام مغرب زدہ ہاتھوں میں ہے۔ ان کا مغربی تصورِ اجتماعیت، حکومت مسلمانوں کے مزاجِ قومی کے مطابق نہیں۔ اربابِ حکومت مغربی فضا کے تربیت یافتہ

ہونے کی حیثیت سے معذور ہیں۔ وہ صرف مغرب کا نظام ہی رائج کر سکتے ہیں۔ عوام کا تقاضا اور ان کی کیفیت جداگانہ ہے۔ مسلم لیگ نے اپنی دس سال کی سیاسی جدوجہد میں ان کے تحت الشعوری خلش کو ابھارا کہ پاکستان نفاذِ نظامِ اسلامی کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے۔ اگر عوام کو ان خطوط پر نہ تیار کیا جاتا، یا ان کی اس خلش کو یوں برانگیختہ نہ کیا جاتا تو آج ان کا مطالبہ شاید کچھ اور ہوتا۔ مسلم لیگ نے دانستہ ان کو اس طرح ابھارا، اور اب کیفیت یہ ہے کہ وہ غیر مطمئن ہیں۔ قیامِ پاکستان سے صرف وہی طبقات و افراد مطمئن ہو سکے ہیں جن کے قلب میں کوئی خلش نہیں تھی۔ جن کے پیشِ نظر ذاتی مناصب و شخصی منافع تھے اور وہ ان کے حصول میں مصروف ہیں۔ جہاں تک اربابِ حکومت کے مغرب زدہ تصورِ سیاست کا تعلق ہے، پاکستان کا مل جانا اطمینان بخش ہے۔ وہ خود تو مطمئن ہیں لیکن جو مطمئن نہیں انہیں وہ شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ دیوانے — باغی — پاکستان کے خلاف ہیں۔

عوام غیر مطمئن ہیں کیونکہ ان کی جس خلش کو برسوں ابھارا جاتا رہا اس کی تسکین کا اب کوئی سامان نہیں۔ حتیٰ کہ روٹی کا مسئلہ جو غریب کے سامنے سب سے پہلے آتا ہے، پاکستان میں اس کا بھی اطمینان بخش حل نہیں۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ اس ضمن میں جو حل پیش کرتے ہیں حکومت انہیں شک کی نگاہوں سے دیکھتی ہے (اور دیکھنا بھی چاہیئے) لیکن عوام کی اس مصیبت کا کوئی عملی حل خود پیش نہیں کرتی۔ کرتی فقط اتنا ہے کہ عوام کو ان کمیونسٹ وغیرہ سے دور رکھنے کے لئے اسلامی کمیونزم وغیرہ قسم کی مغالطہ انگیز اصطلاحات سے کام لیتی ہے۔ اس روش نے اوپر کے طبقہ کو منافق بنا دیا ہے۔ منافقت پھر عدم اطمینان کا باعث ہے۔ اطمینان اسلام میں ہے، منافقت میں نہیں (منافقین کے لئے جہنم میں بھی درکِ اسفل ہے) پھر دیکھئے کہ قوم کی حالت کیا ہے؟ مُلّا کے مقاصد رجعت پسندانہ اور خود غرضانہ ہیں۔ اربابِ اقتدار کی روش منافقانہ ہے۔ عوام کے تحت الشعور میں جو خلش ہے اس کا کوئی علاج نہیں، ان کی روٹی کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ وہ غیر مطمئن ہیں۔ جنوں زدہ طبیعت میں بغاوت کے آثار رونما ہیں۔

صاحبِ فکر

ایسے میں کیا ہو گا؟ اس عدمِ اطمینان اور منافقت کے طبقاتی گرداب سے قوم بچ سکتی ہے تو کسی صاحبِ فکر کے صدقہ میں بچ سکتی ہے۔ مسلمانوں کا صاحبِ فکر اقوامِ دیگر کے اصحابِ فکر سے مختلف اور نرالا ہوتا ہے۔ یہ صاحبِ فکر ہی نہیں ہوتا، صاحبِ جنوں بھی ہوتا ہے۔ اس میں عشق و عقل، نظر اور خبر کا امتزاج ہوتا ہے۔ وہ تنہا عقل نہیں ہوتا کہ مصلحت کوشیوں پر نگاہ رکھے اور جراتِ رندانہ سے محروم ہو، نہ وہ محض جنوں ہوتا ہے کہ اسے پاسِ گریباں بھی نہ ہو۔ وہ اس کی تفسیر ہوتا ہے کہ

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں، مستقبل اُس کے ہاتھ میں ہے جس کا سینہ کشمکش کی آماجگاہ ہے کیونکہ

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

ایسا صاحبِ فکر کہ اس کے سینہ میں قرآن کی تڑپ ہو۔ اس کے فکر کی روشنی میں قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا نظام متعین ہو سکتا ہے جس میں ہر ایک کو صحیح اطمینان حاصل ہو جائے اور ملت اس نورِ ربانی کی روشنی میں اپنی منزلِ صحیح کی جانب گامزن ہو سکے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر وہ حقیقی آزادی میسر آئے گی جس کے بغیر ہماری موجودہ آزادی ایک بادہ ہے بے کیف، ایک جسد ہے بے روح۔ اس کے بغیر ہم آئینی آزادی سے تو شاید ہمکنار رہ سکیں اس حقیقی آزادی کو کبھی پا نہیں سکیں گے جو ان بے شمار اطواق و سلاسل کو توڑتی ہے جو انسان نے از خود پہن رکھی ہیں۔ آزادی کے یوم ہر سال آئیں گے اور گزر جائیں گے۔ ہم خوشیاں بھی منائیں گے، لیکن اس استخواں خوری سے کچھ نفع نہیں ہوگا، جب تک ہم مغز تک نہیں پہنچیں گے، یوم ہائے آزادی کے جشن بے روح بن کر رہ جائیں گے اور بس۔

اس حقیقی آزادی کے حاصل نہ ہونے سے پاکستان کے قیام نے ہم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی اور ہم بدستور وہیں ہیں جہاں قیامِ پاکستان سے بیشتر تھے۔ ہم اگر بدستور فروعات میں الجھے رہے اور ظواہر و رسوم کے غلام بنے رہے تو جو کچھ ہونے والا ہے اس کا عکس ابھی سے دیکھ لیجئے۔ مُلّا اور اربابِ حکومت میں سمجھوتہ ہونے کے امکانات قوی ہیں۔ ایسا ہو گیا تو ہماری ساری جدوجہد اکارت جائے گی اور تاریخ نئے اوراق الٹنے کے بجائے پرانے اوراق اُلٹے گی۔ ہم غیروں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنوں کے غلام ہو چکے ہوں گے۔

نئی غلامی

پاکستان باقی مسلمان سلطنتوں کی طرح ایک سلطنت بن جائے گی، فرق صرف یہ ہوگا کہ وہاں ایک شخص کی حکمرانی ہے، یہاں متعدد اشخاص کی ہوگی۔ وہ شخصی اجارے ہیں، یہ مشترکہ ادارہ ہوگا۔ "تخت و مصلّے" کا یہ سمجھوتہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک عظیم حادثہ ہوگا۔ ایسا حادثہ جس سے جانبر ہونا صدیوں کی بات ہو جائے گی۔

لہٰذا آیئے! یومِ آزادی مناتے ہیں تو عہد کیجئے کہ حقیقی آزادی سے ہم کنار ہو کر رہیں گے۔ اس کی یہی صورت ہے کہ قرآن نے جن اطواق و سلاسل کو ایک بار توڑا تھا اور جن کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو جوڑ کر ہم نے پھر وہی

۱؎ اس وقت ایک ایسے آئین کا تصور دیا جا رہا تھا جس میں مملکت میں قانون سازی کے اختیارات، علماء بورڈ کے سپرد کئے جا رہے تھے۔

عزمِ محکم

زنجیریں تیار کرلی ہیں، آج پھر اُن زنجیروں کو ایک جھٹکے سے توڑیں اور حیاتِ اجتماعیہ کو اس قالب میں ڈھال لیں کہ محکومیت صرف اللہ کی جائز ہے، انسان کو انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ انسان نہ حاکم ہے نہ محکوم۔ وہ خدائی قوانین کا نافذ کرنے والا اور آپس میں ائتلاف اور محبت سے کام لینے والا ہے۔ گویا بالفاظِ صحیح تر، ہم قرآن اور اسلام کا نظام اپنے اوپر مسلط کریں اور انسانیت کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرائیں۔ یاد رکھئے! یہ تسلط صرف قدمِ اول کا منتظر ہے۔ آیئے جرأتِ ایمان سے کام لیں اور یہ قدمِ اوّل اٹھائیں۔

لیکن اس "زورِ جنوں" میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ ہونے دیجئے کہ جس نظام کو ہم مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ اس سرزمین کے ٹکڑے کے بغیر کبھی مسلط نہ ہوسکے گا جو ہمیں خدا کی موہبت سے مل گیا ہے جسم کے بغیر اس عالمِ اسباب میں، جان کا تصور ممکن نہیں۔ اس لئے اس قطعۂ زمین کا تحفظ نہایت ضروری ہے کہ

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

اس سرزمین کی بخشائش پر ہماری گردنیں اُس بارگاہِ صمدیت کے حضور وفورِ تشکر و امتنان سے جھک جاتی ہیں جس نے ہم ناتوانوں کو اس عطیۂ عظمیٰ سے نوازا۔ اسی سے ہم استعانت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمادے کہ ہم اس سرزمین کو اُس کے تختِ اجلال کی جولانگاہ بنا سکیں۔

اور جب خدا کے حضور سجدۂ تشکر کا ذکر آیا ہے، تو بعد از سپاس گزاری ہوگا اگر ہم قوم کے اُس "مخلص وکیل" کا شکریہ ادا نہ کریں جس نے اپنی فراست و دیانت سے اتنا عرصہ بلا مزد و معاوضہ قوم کا مقدمہ لڑا، اور اسے اس سرزمین کا قبالہ لے دیا۔ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس محسنِ ملت کی زیرِ بار احسان رہیں گی۔ لیکن پاکستان کا استحکام اس "قبالہ" حاصل کر لینے سے نہیں ہوگا۔ یہ مشروط ہوگا ہماری اپنی صلاحیتوں پر۔ اور یہ صلاحیتیں "ایمان و اعمالِ صالحہ" کے بغیر ناممکن ہیں۔

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

ہر اتوار کو ——— صبح آٹھ بجے

۲۵/بی گلبرگ لاہور میں ہوتا ہے!

(نمائندہ بزم طلوع اسلام لاہور)

قرآنی دعوتِ فکر کے عہد آفریں شاہکار

۱۔ لغات القرآن یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے، یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ، پچاس روپے ہیں۔

۲۔ اسلام کیا ہے؟ یہ مسائل کی کتاب نہیں، یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں، وہ کس قسم کا معاشرتی معاشی سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے، اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت (قسم اعلیٰ) آٹھ روپے۔ (جیب ایڈیشن) چار روپے۔

۳۔ سلیم کے نام سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اس کے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول آٹھ روپے۔ حصہ دوم سوم چھ چھ روپے

۴۔ نظامِ ربوبیت نظام سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے۔ اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

۵۔ خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصر معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ قیمت۔ (قسم اعلیٰ مجلد) نو روپے، (قسم دوم) پانچ روپے

۶۔ سلسبیل قرآنی بصیرت کا چشمہ رواں۔ یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں ـــ قیمت آٹھ روپے۔

۷۔ بہارِ نو یہ مقالات کے مجموعہ کا دوسرا حصہ ہے جس سے ذہن میں جلا پیدا ہوتا ہے اس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ سستا ایڈیشن۔ قیمت۔ پانچ روپے۔

۸۔ اسبابِ زوالِ امت ملا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اس لئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے۔ اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت دو روپے

۹۔ اسلامی معاشرت | اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ انداز بیان سلیس اور دلچسپ۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپے۔

۱۰۔ قرآنی فیصلے | زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اول ۳/۲۵، جلد دوم ۳/۲۵، جلد سوم ۳/- روپے۔

۱۱۔ قرآنی قوانین | ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ وکلا۔ حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ قیمت ۳/- روپے

۱۲۔ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں | تمام مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی۔ وہ کیسے مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گزریں اور آج ان کی حالت کیا ہے۔ قیمت ۳/- روپے۔

۱۳۔ جہاد | اسلام کے اہم ترین اور اس کے ساتھ ہی نازک ترین موضوع پر مختصر لیکن جامع کتاب۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات۔ قیمت دو روپے۔

۱۴۔ پاکستان کا معمار اول | ہماری نئی نسل سرسید کے عظمت مقام سے ناواقف ہے۔ اس کی سیرت و کردار اور مسلمانوں کے لئے اس کی خدمات کا تعارف نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ قیمت ۳/- روپے

۱۵۔ عربی خود سیکھئے | قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اسلئے ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۴/۵۰ روپے

۱۶۔ مقام حدیث | وہ کتاب جس نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کا صحیح مقام متعین کرنے کیلئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے۔ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علم حدیث کے متعلق اہم ایک کتاب کے اندر اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت ۴/- روپے

۱۷۔ الفتنۃ الکبریٰ | مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مؤرخ طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟۔ قیمت چھ روپے

یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی دیگر تمام تصانیف کے ملنے کا پتہ

ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کا تبصرہ

محترم مرکزی وزیرِ قانون سے ایک سوال

پاکستان کا تصور اور مطالبہ — اس کے حصول کے لئے جدوجہد، اور آخرالامر اس کی تشکیل — اس سارے پروگرام سے مقصد صرف ایک تھا۔ اور وہ یہ کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین مل جائے جس میں صحیح اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ اسلامی نظام کا اساسی تقاضا یہ ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ کسی ملک میں کس قسم کے قوانین مرتب اور نافذ ہوں گے، اس کے لئے، اس مملکت کے آئین (کانسٹی ٹیوشن) میں اصولی ہدایات دی جاتی ہیں۔

طلوعِ اسلام نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں کیا خدمات سرانجام دیں، ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس قسم کے خطۂ زمین کا حصول، طلوعِ اسلام کے نزدیک جزوِ ایمان تھا (کیونکہ قرآن کریم کی رُو سے اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام کے مطابق زندگی بسر ہی نہیں کی جا سکتی)۔ اور ظاہر ہے کہ جو کام دین کے تقاضے کی رو سے کیا جائے، وہ نہ کسی کے سر پر احسان ہوتا ہے، اور نہ ہی اس کی سرانجام دہی پر ستائش کی تمنا یا صلہ کی آرزو رکھنی چاہیئے۔ لیکن جس تقاضائے دینی کی رُو سے طلوعِ اسلام نے جدوجہد میں حصہ لیا تھا، وہی تقاضا اس امر کا بھی محرک تھا کہ یہ دیکھا جائے کہ یہاں جو دستور مرتب ہوتا ہے، وہ اسلامی قوانین کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں کس حد تک دین کا تقاضا پورا کرتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے پہلے دن سے پاکستان میں قانون سازی کے سلسلہ میں اس قدر جذب و انہماک سے کام لیا ہے۔

قانون سازی کے سلسلہ میں یہاں، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے، یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ (نظر بظاہر) یہ مطالبہ ایسا تھا جس کے خلاف خفیف سے اعتراض کی بھی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن طلوعِ اسلام کو قرآن کریم پر غور و فکر اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے بتوفیقِ ایزدی جو بصیرت حاصل ہوئی تھی، اُس کی رُو سے اُس نے محسوس کیا کہ یہ نعرہ مقدس جذبات پر مبنی ہے عملی دنیا

ین اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں کوئی ایسا قانون بن ہی نہیں سکے گا جو تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ ہو سکے۔ اس کی وجہ بالکل واضح تھی۔ یعنی

(۱) کتاب (یعنی قرآن کریم) تو ایک ایسی کتاب ہے جس کا متن مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے، لہٰذا اگر کسی قانون کے متعلق یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ قرآن کے کسی حکم یا اصول کے خلاف نہیں تو وہ قانون "کتاب و سنت کے مطابق ہونے" کی شرط کے جزوِ اول (کتاب) کو پورا کر دے گا۔

(۲) لیکن "سنت" کی پوزیشن یہ نہیں۔ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس کا متن (قرآن کے متن کی طرح) مسلّمہ اور متفقہ طور پر "سنتِ رسول اللہ" تسلیم کیا جاتا ہو۔ اتنا ہی نہیں۔ امت کے "علمائے کرام" اس بات پر بھی متفق نہیں کہ سنت کہتے کسے ہیں۔ کوئی کہتا ہے ہر حدیث سنت ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ سنت، اس عمل رسول اللہ کا نام ہے جسے حضورؐ نے عام طور پر کیا ہو۔ دوسری طرف سے آواز اٹھتی ہے کہ نہیں۔ سنت، ہر عملِ رسولؐ کا نام نہیں۔ سنت، ان اعمالِ رسول اللہ کو کہتے ہیں جنہیں حضورؐ نے اپنی شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ منصبِ رسالت کی جہت سے کیا ہو۔ غرضیکہ سنتِ رسول اللہ کا متفق علیہ مجموعہ تو ایک طرف، سنتِ رسول اللہ کی متفق علیہ تعریف (DEFINITION) بھی طے نہیں پا سکی۔ عوام کے نزدیک ہمارا یہ بیان ناقابلِ فہم سا ہوگا لیکن جو لوگ دین کے علم اور تاریخ اسلام سے واقفیت رکھتے ہیں وہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

اس عملی دشواری کے پیشِ نظر ہم نے یہ تجویز پیش کی کہ دستور پاکستان میں صرف اتنی شق ہونی چاہیئے کہ ملک کا کوئی قانون قرآن کریم کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس پر مذہبی طبقہ کی طرف سے شور مچا دیا گیا کہ طلوع اسلام منکرِ سنت رسول اللہ ہے۔ اور چونکہ یہ نعرہ عوام کو بڑا اپیل کرتا تھا اس لئے اس شور نے نہایت آسانی سے ہنگامہ کی شکل اختیار کر لی۔ ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب پرست طبقہ میں ایسے حضرات بھی تھے جو خلوصِ نیت سے سمجھتے تھے کہ اگر قانون سازی کے سلسلہ میں قرآن کے ساتھ سنت کا اضافہ نہ کیا جائے، تو اسلام نامکمل رہ جاتا ہے۔ لیکن اس میں بیشتر وہ لوگ تھے جو اپنی مفاد پرستیوں اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اس مطالبہ پر زور دیئے چلے جا رہے تھے۔ اس ہنگامہ خیزی میں جماعتِ اسلامی پیش پیش تھی۔ اس لئے کہ اس جماعت کے نزدیک "سنتِ رسول اللہ" وہ ہے جسے "مزاج شناسِ رسولؐ" (یعنی ان کا امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی) سنت قرار دیدے۔ ظاہر ہے کہ "سنتِ رسول اللہ" کی اس تشریح کی رُو سے، قانون سازی کا سارا اختیار جماعتِ اسلامی کے اس امیر کے ہاتھوں میں آجاتا ہے ۔۔۔ وہ، جس قانون کے متعلق کہہ دے کہ مطابقِ سنت ہے وہ نافذ العمل ہو سکے گا۔ جس کے متعلق کہہ دے کہ وہ خلافِ سنت ہے، وہ مردود قرار پا جائے گا۔ چنانچہ ہم نے جماعتِ اسلامی کے اس مقدس فریب کی

نقاب کشائی کی ـــــ اور اب تک کئے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ جماعت، طلوعِ اسلام کے خلاف ہنگامہ خیزی بنا پیش پیش رہتی ہے۔

جب (چوہدری محمد علی صاحب کا مرتب کردہ) ۱۹۵۶ء کا دستور منظور ہوا ہے تو اس میں چونکہ "کتاب وسنت" کی شق موجود تھی، اس لئے جماعتِ اسلامی نے اعلان کیا کہ اس دستور کی منظوری کے بعد "مملکت مسلمان ہو گئی ہے" لیکن چونکہ اس دستور کے مرتب کرنے والوں کو اس کا علم تھا کہ مختلف فرقوں کے علماء سنت کے مفہوم پر متفق نہیں ہوں گے، اس لئے انھوں نے اس دستور میں، اس شق کا اضافہ کر دیا کہ "جہاں تک شخصی قوانین (پرسنل لاز) کا تعلق ہے، ہر فرقہ کی کتاب وسنت کی اپنی اپنی تعبیر قابلِ تسلیم ہوگی"۔ یعنی شخصی قوانین ہر فرقہ کے الگ الگ ہوں گے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کی (جسے منظور کرنے پر جماعتِ اسلامی کے اعلان کے مطابق، مملکت مسلمان ہو گئی تھی) بنیادی شق ہی خلافِ قرآن تھی۔ قرآن کریم کی رُو سے (۱) پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ اور (۲) امت میں فرقہ سازی (بنصِ صریح) شرک ہے۔

۱۹۶۲ء کے آئین میں ابتداءً یہ کہا گیا تھا کہ "ملک کا کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا"۔ اس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق بھی نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی مذہبی فرقوں کو آئینی طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ اس حد تک یہ آئین، بہرحال ۱۹۵۶ء کے آئین کے مقابلہ میں، قرآن سے زیادہ قریب تھا۔ لیکن جماعتِ اسلامی نے اس کے خلاف شور برپا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دستور میں (۱۹۵۶ء کے دستور کے مطابق) ترمیم کرنی پڑی۔ چنانچہ اس وقت آئینی طور پر پوزیشن پھر وہی ہے جو ۱۹۵۶ء کے دستور کی رُو سے تھی۔

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں ملک میں تعطل ہے کیونکہ جب یہی طے نہیں کہ سنت کہتے کسے ہیں تو کوئی ایسا قانون بن کیسے سکتا ہے جو "سنت کے مطابق ہونے" کی شرط کو پورا کر سکے۔ جماعتِ اسلامی بساطِ سیاست کی بڑی چابکدست شاطر ہے۔ اس نے یہ پوزیشن تو خود پیدا کر رکھی ہے جس سے ملک میں کوئی اسلامی قانون مرتب ہی نہ ہو سکے، اور سراپیگنڈہ یہ کئے جا رہی ہے کہ حکومت، اسلامی قوانین جان بوجھ کر مرتب اور نافذ نہیں کرتی۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم نے اپریل ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں، ایک مرتبہ پھر سنت کے متعلق صحیح پوزیشن واضح کی اور مرکزی حکومت کے وزیرِ قانون، محترم ایس۔ ایم۔ ظفر صاحب سے درخواست کی کہ وہ دستورِ پاکستان کی اس شق کا مفہوم متعین کریں کہ "ملک کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا"۔ محترم موصوف کی طرف سے تو اس سلسلہ میں کوئی بیان ہماری نظر سے نہیں گزرا، لیکن ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے ترجمان

ماہنامہ فکر و نظر کی جون ۱۹۶۸ء کی اشاعت (کے نظرات — یعنی اداریہ) میں طلوع اسلام کے موقف سے متعلق تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

قارئین کو معلوم ہوگا کہ دستورِ پاکستان کی رُو سے ایک اسلامی مشاورتی کونسل عمل میں لائی گئی ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ حکومت کو بتائے کہ فلاں (مجوزہ) قانون، کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کونسل کو تحقیقاتی مواد بہم پہنچانے کے لئے، ادارہ تحقیقات اسلامی قائم کیا گیا ہے۔ یہ ہے اس ادارہ کی پوزیشن — چنانچہ جب ہم نے دیکھا کہ اس ادارہ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے تو ہمیں خوشی ہوئی کہ یہ بحث جو بیس برس سے، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح، ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی ہے، کچھ تو آگے بڑھے گی۔ لیکن جب ہم نے ان "نظرات" کو پڑھا تو ہمیں افسوس بھی ہوا اور مایوسی بھی — افسوس اس بات پر کہ اس میں تنقید کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ اس قسم کے ادارہ کے قطعاً شایانِ شان نہ تھا۔ اور مایوسی اس لئے کہ انہوں نے ایسے اہم بنیادی مسئلہ کو سلجھانے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یا تو اصل بات ان کے پلے ہی نہیں پڑ رہی، اور یا ان کی مصلحت کوشیاں انہیں کھل کر بات کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ وجہ کچھ بھی ہو، نتیجہ اس کا بے حد تاسف انگیز اور مایوس کن ہے۔ ایک ایسا ادارہ جو آئینی طور پر وجود میں لایا گیا ہے اور جس پر غریب پبلک کا اس قدر روپیہ صرف ہو رہا ہے، اگر وہ آئین کی ایک شق کا مفہوم بھی متعین نہیں کر سکتا تو اس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے — آپ سنئے، اور غور سے سنئے کہ انہوں نے اس باب میں کیا کہا ہے۔

دستورِ پاکستان کی شق یہ ہے کہ "ملک کا کوئی قانون، قرآن اور سنت کے خلاف نہیں ہوگا"۔ طلوع اسلام نے کہا یہ تھا کہ قرآن کریم کے متن کے متعلق تو کسی کو اختلاف نہیں۔ اس سلسلہ میں فکر و نظر نے لکھا ہے۔

> سب سے پہلے ہم طلوع اسلام کے اس بیان کو لیتے ہیں، جسے وہ بار بار دہراتا رہتا ہے کہ "قرآن کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک متعین و معروف کتاب ہے، جس کا ایک ایک لفظ تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ اس کی کسی سورت یا آیت کے متعلق تو ایک طرف، اس کے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ قرآن میں ہے یا نہیں"۔ بے شک جہاں تک قرآن کے متن کا تعلق ہے، ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہے۔ لیکن اس متن کی تشریح و تعبیر میں شروع سے اختلاف رہا ہے۔ اسی لئے ہر عہد میں قرآن کی لاتعداد تفسیریں لکھی گئیں اور خود صاحب طلوع اسلام کو نہ صرف قرآن کی اپنی تفسیر کرنی پڑی، بلکہ وہ مجبور ہو گئے کہ اپنی کتاب "لغات القرآن" کی تین جلدیں

میں قرآن کے الفاظ کے نئے معانی اور مفہوم متعین کریں۔

ہم ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر دستورِ قرآن کی پوزیشن یہی ہے کہ اس کے متن کا متفق علیہ ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا کیونکہ "اس متن کی تشریح و تعبیر میں شروع سے اختلاف رہا ہے" تو دستورِ پاکستان میں جو یہ کہا گیا ہے کہ "ملک کا کوئی قانون دستورِ قرآن کے خلاف نہیں ہوگا" تو اس کا عملی مفہوم اور فائدہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اشک شوئی اور عوام کے جذبات کی جھوٹی تسکین کے لئے طفل تسلی کے طور پر شاملِ دستور کر لیا گیا ہے؟

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ اگر اس کتاب (قرآن) کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے ہر شخص کے منشاء کے مطابق مطلب نکل سکتا ہے تو (معاف بفرمائیے) علمی اور قانونی دنیا میں اس قسم کی کتاب کی قیمت کیا رہ سکتی ہے؟ اور اس کا جو دعویٰ ہے کہ

وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (۴/۸۲)

اور اگر یہ کتاب خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔

تو اس دعویٰ کا مفہوم کیا ہے؟ اور اگر ملک کے قوانین کے سلسلہ میں اس کتاب سے کوئی ایک متعین مفہوم لیا ہی نہیں جا سکتا۔ (یعنی اس کتاب میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ ایسا متعین مفہوم دے سکے) تو یہ قانون کی بنیاد کیسے بن سکتی ہے؟ ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی طرح) ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے ارباب فکر و نظر بھی قرآن کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپریل ۱۹۶۸ء کے فکر و نظر میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ

احکام و مسائل کا استخراج نصوص پر مبنی تھا۔ یہ نصوص شارع علیہ السلام سے لے کر آخر تک عربی زبان میں تھیں۔ اور عربی زبان کے الفاظ بیک وقت متعدد اور متضاد معنوں کے حامل ہو سکتے ہیں۔

سو قرآن کے لئے خدا نے جس زبان (عربی) کا انتخاب کیا، جب اس زبان کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے الفاظ بیک وقت متعدد اور متضاد معانی کے حامل ہو سکتے ہیں تو اس قرآن سے متفق علیہ معانی اخذ کرنا ناممکن ہے یہ ہے ان حضرات کا عقیدہ قرآن کے متعلق! انا للہ وانا الیہ راجعون!

ہماری بصیرت کے مطابق صورت یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم کے کسی حکم یا اصول کے دو متضاد معانی ہو نہیں سکتے۔ چنانچہ جب تک (صدرِ اول میں) اسلامی نظامِ مملکت قائم رہا، کسی قرآنی حکم کے دو متضاد مفہوم لئے ہی نہیں گئے۔

(۲) جب اسلامی نظامِ مملکت باقی نہ رہا، تو قرآنی مفہوم انفرادی طور پر لیا جانے لگا اور وہ اس طرح کہ قرآن کو تابع کر دیا گیا (پہلے) روایات کا، اور (پھر) فقہ کا۔ چنانچہ امت میں اس قسم کے عقاید پھیلا دیئے گئے کہ حدیث

قرآن پر قاضی ہے۔ حتیٰ کہ اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔ یا جب کسی قرآنی آیت اور امام فقہ کے قول میں تضاد نظر آئے، تو اول تو قرآنی آیت کی تاویل کی جائے۔ اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو پھر قرآنی آیت کو منسوخ سمجھ لیا جائے۔ قرآنی متن کی تشریح و تعبیر کے اختلاف کا جو رونا، فکر و نظر روتا ہے، وہ اس طرح وجود میں آیا تھا۔

(۳) دین میں حجت قرآن کریم کا متن ہے نہ کہ کسی انسان کی تشریح، تفسیر یا تعبیر[1]۔ امت پر یہ مصیبت اس لئے آئی ہے کہ اس نے انسانوں کی تشریح و تعبیر کو سند اور حجت قرار دے رکھا ہے۔

(۴) اگر کوئی مملکت اپنے ہاں قرآنی قوانین نافذ کرنا چاہے تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ وہ قرآن کریم کے متن کو سند و حجت قرار دے۔ انسانوں کی کسی تعبیر و تشریح کو یہ درجہ نہ دے۔ پھر ارباب علم و بصیرت پر مبنی ایک مشیری متعین کرے جو قرآن پر غور و فکر کے بعد اس کے احکام و اصول کا مفہوم متعین کرے۔ اس مفہوم کے مطابق جو قوانین اس مملکت کی طرف سے نافذ ہوں گے وہ اسلامی قوانین کہلائیں گے۔ قرآن کریم کی جو آیت پہلے نقل کی گئی ہے (یعنی وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا) تو اس سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ یعنی اگر یہ قرآن میں تدبر سے کام لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ لہٰذا اگر اسلامی مملکت کے ارباب علم و بصیرت قرآن پر تدبر کریں تو (قرآن کے دعوے کے مطابق) قرآنی احکام و اصول کا متعین مفہوم ان کے سامنے آجائے گا بشرطیکہ وہ کسی انسانی تعبیر و تشریح کو اپنے "تدبر فی القرآن" پر اثر انداز نہ ہونے دیں۔

(۰)

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے نزدیک قرآن کے متن کا متفق علیہ ہونا، قانون سازی کے سلسلہ میں کچھ کام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا دستور پاکستان کی شق کا جزو اول تو یوں بے کار ہو گیا۔ اب آیئے اس شق کے جزو ثانی (یعنی سنت) کی طرف۔ طلوع اسلام نے جس دشواری کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ امت کے پاس کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے متن کے متعلق متفق طور پر کہا جا سکے کہ وہ "سنت رسول اللہ" کا مظہر ہے۔ حتیٰ کہ آج تک "سنت" کی کوئی متفق علیہ تعریف (DEFINITION) بھی نہیں کی جا سکی۔

---

[1] واضح رہے کہ جہاں تک پرویز صاحب کا تعلق ہے، وہ اپنی ہر کتاب میں بالفاظ صریح واضح کر دیتے ہیں کہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا گیا ہے وہ قرآن کریم کے سمجھنے کی طالب العلمانہ کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا ہر وقت امکان ہے اس لئے یہ کسی کے لئے سند و حجت نہیں ہو سکتا۔

اب دیکھئے کہ فکر و نظر اس مسئلہ میں کیا کہتا ہے۔ ارشاد ہے۔

کتاب کے ساتھ "سنت" کے لزوم کے متعلق ہم یہاں ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔ "قانون سازی کے سلسلے میں ہمارے ہاں علماء کے بعض طبقوں کی طرف سے جو دخل اندازی ہوتی رہتی ہے، میرے نزدیک اس کا یہ حل نہیں کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے بجائے صرف کتاب کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کے متن پر سب کا اتفاق ہے اور سنت کے مواد بلکہ خود سنت سے کیا مراد ہے اس بارے میں وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کہہ دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو یہ ملحوظ رہے کہ رسول اللہ صلعم کی تیئس سالہ جدوجہد قرآن سے پوری طرح مربوط ہے۔ آخر قرآن کا نزول کوئی خلا میں تو نہیں ہوا۔ وہ آپؐ کی طویل جدوجہد کے دوران برابر آپؐ کی رہنمائی کرتا رہا۔ اس لئے ایک کو دوسرے سے الگ کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ یہ غیر مستحسن بھی ہے۔ واقعہ ہے کہ اس پس منظر کو سامنے رکھے بغیر جس میں رسول اللہ صلعم مصروف عمل رہے، اکیلے قرآن کا مطالعہ ناقابلِ فہم رہتا ہے۔ چنانچہ ان معنوں میں آپؐ کا عمل اتنی ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس قدر کہ قرآنی احکام۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی عمل ہے جسے سنت یا آپؐ کا اسوۂ حسنہ سمجھنا چاہیئے۔ اسی کی روشنی میں ہم قرآن سمجھ سکتے اور اپنی روزمرہ کی زندگی نیز قانون سازی کے لئے اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

یعنی، قرآن کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مصروف عمل رہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس ادارہ کی تحقیق انیق نے اس قدر مشکل مسئلہ کا حل کس آسانی سے پیش کر دیا؟ یعنی اس پس منظر کو سامنے رکھئے جس میں رسول اللہ نے عمل فرمایا۔ بات صاف ہو جائیگی۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ "پس منظر" متفق علیہ طور پر ملے گا کہاں سے؟ اسی پس منظر کا اختلاف ہی تو ہے جس سے سنتِ رسولِ اللہ کا کوئی متفق علیہ مجموعہ مرتب ہو سکا ہے نہ ہو سکے گا۔ "روایات" کو "پس منظر" کہہ دینے سے مشکل حل نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے الفاظ میں "قرآن میں کسی تیار شدہ قانون کا وجود نہیں ہے کہ اسے وہاں سے چپکے سے اٹھا کر آج کی زندگی کے ساتھ پیوند کر دیا جائے۔ اس کے لئے تو اخذ و استنباط و اختیار کا وہ طریق اپنانا ہوگا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یعنی پہلے ہر قرآنی حکم کو اس موقع و محل میں دیکھا

جائے جس میں یہ حکم صادر ہوا۔ اس کے لئے لازماً سنت کی ضرورت ہوگی۔ پھر اس حکم سے اصول اخذ کیا جائے اور اس کے بعد اس اصول کا موجودہ حالات پر اطلاق ہو۔ اسی صورت میں اسلامی قانون اپنے صحیح معنوں میں ہمیں مل سکے گا۔"

آپ نے غور فرمایا کہ انھوں نے "بکلا پکڑنے" کا کیسا استادانہ طریقہ بتایا ہے؟ یعنی پہلے ہر قرآنی حکم کو اس موقع و محل میں دیکھا جائے جس میں یہ حکم صادر ہوا۔ اس کے لئے لازماً سنت کی ضرورت ہوگی۔ پھر اس حکم سے اصول اخذ کیا جائے اور اسکے بعد اس اصول کا موجودہ حالات پر اطلاق کر دیا جائے"۔ اللہ اللہ۔ خیر صلاّ ـــــ کہیئے! ہو گئی ناں مشکل آسان؟

یہاں یہ سوال سامنے آتا تھا کہ اصل بات تو "سنت" کو متعین کرنے کی تھی۔ اس کا کیا علاج کیا جائے۔ اسکا علاج بھی سن لیجئے۔ تحریر ہے۔

قرآن کو اس طرح سمجھنے اور اس سے ایسے اصولوں کو اخذ کرنے کے لئے "سنت" یعنی "عمل" رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واسطہ ضروری ہے اور یہ واسطہ حقیقی طور پر "سنت" کی تحقیق و تنقیدی مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے ... اس کے لئے ضرورت ہے سب فرقوں کی "سنتوں" کی مدد سے "عمل" رسول کا صحیح تعین۔ پھر اس "عمل" رسول کا اس عہد کے حالات و واقعات کے پس منظر میں صحیح صحیح جائزہ۔ اور اس سے عمومی اصولوں کا اخذ کرنا۔

آپ نے کچھ سمجھا کہ بات کیا ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ دستور پاکستان میں یہ شق رکھ دی گئی ہے کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے، وہ (اس ادارہ کی تحقیق کی رُو سے) سنت کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔

اور "سنت" اس وقت کہیں موجود نہیں۔ اسے "تحقیق و تنقیدی مطالعہ کے بعد مختلف فرقوں کی سنتوں کی مدد سے متعین کرنا ہوگا"۔

فرض کر لیجئے کہ "سو پچاس سال بعد اس طرح سنت رسول اللہ" متعین ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد قانون سازی کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ اس کا جواب، ہم سے نہیں خود ادارہ تحقیقات اسلامی کے الفاظ میں، سنیئے۔ ارشاد ہے۔

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ "طلوع اسلام" کی تعمیل ارشاد کرتے ہوئے اسلامی مشاورتی کونسل اور ادارہ تحقیقات اسلامی نے "سنت" کی وضاحت کر دی، تو آخر اس وضاحت کو پاکستان کی غالب اکثریت سے تسلیم کرانے کی ذمہ داری کس کی ہوگی؟ کسی ملک کا دستور نظری اور عملی طور پر اس کے عوام کی اکثریت

کی امنگوں اور ضرورتوں کا مظہر ہوتا ہے۔ اب اگر وہ کسی فرد یا کسی ادارہ کی کسی تعبیر کو نہیں مانتی، تو کیا حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اسے ماننے پر اس کو قانوناً مجبور کرے اور مذہبی احتساب سے کام لے۔

ہم اس ادارہ سے گزارش کریں گے کہ وہ یہ سوال ہم سے نہیں، دستورِ پاکستان کے مرتبین سے، یا حکومتِ پاکستان سے پوچھے کہ اگر کل کو آپ نے (آئین کے مطابق) ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ کر دیا جو آپ کی دانست میں "سنتِ رسول اللہ" کے عین مطابق ہے اور ملک کی غالب اکثریت اسے مطابقِ سنت تسلیم نہیں کرتی تو اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟ اس ضمن میں "غالب اکثریت" کی بھی شرط کیوں عاید کی جائے۔ ملک کی کوئی جماعت یا فرقہ اسے مطابقِ سنت تسلیم نہیں کرتا تو کیا حکومت اس وقت مذہبی احتساب سے کام لے کر اسے' اس قانون کو ماننے پر مجبور کر دے گی؟ ہم "اربابِ فکر و نظر" سے پُرزور درخواست کریں گے کہ وہ اس سوال کو ذمہ دار حضرات سے ضرور پوچھے اور ان کے جواب سے ملک کو مطلع کرے، تاکہ یہ بات تو صاف ہو جائے کہ یہ حالاتِ موجودہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی اس نگارش سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ تو یہی ہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہو ہی نہیں سکتے، اس لئے صحیح طریق کار یہی ہے کہ ملک میں سیکولر نظام رائج کیا جائے۔ لیکن یہ حضرات اپنے دل کی اس بات کو کھلے الفاظ میں زبان تک کس طرح لا سکتے ہیں؟ اس صورت میں نہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی باقی رہے گا اور نہ یہ حضرات اس کی کرسیوں پر براجمان! بایں ہمہ' ان کے دل کی بات غیر ارادی طور پر ان کی زبانِ قلم سے نکل گئی ہے۔

اس سلسلہ میں ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ سیکولر نظامِ حکومت' اور اسلامی نظام میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سیکولر جمہوری نظام یہ سوچتا ہے کہ ملک کی اکثریت کیا چاہتی ہے اور اسلامی نظام یہ دیکھتا ہے کہ خدا کا حکم کیا ہے۔ اسلامی قانون ان مسلمانوں پر نافذ ہوتا ہے جو قانونِ خداوندی کے ساتھ وفاداری کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی قانونِ خداوندی ایسا ہے جو اس قوم کی اکثریت کے مفاد کے خلاف بھی جاتا ہے تو اسلامی مملکت اسے بلا تأمل نافذ کر دے گی اور مسلمانوں سے منوائے گی۔ (مثلاً اگر پاکستان کی اکثریت شراب کی عادی ہو چکی ہو تو اس کے باوجود اسلامی مملکت شراب کی ممانعت کے قانون پر عمل کرائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ "فکر و نظر" کے تحت الشعور میں سیکولر نظام کا تصور کروٹیں لے رہا ہے اس لئے وہ اسلامی نظام کے مضمرات کا صحیح اندازہ ہی نہیں کر رہے! یہ ٹھیک ہے کہ اسلامی مملکت' اسلامی قوانین کے نفاذ میں تدریج اور تقاضائے حالات کا خیال ضرور رکھے گی لیکن وہ کسی قانون کے نفاذ سے اس لئے نہیں رُک جائے گی کہ ملک کی اکثریت ایسا نہیں چاہتی۔ اسلامی نظام لوگوں کو خدا کے قانون کے پیچھے چلاتا ہے، خدا کے قانون کو اکثریت

کی آرزوؤں کے تابع نہیں رکھتا۔

(۰)

طلوعِ اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ (قرآن کریم کی رُو سے) اسلام میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ "فکر و نظر" کو اس سے انکار نہیں۔ لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ

> یہ کہہ دینے سے کہ فرقوں کا وجود قرآن کی نصِ صریح کی رُو سے شرک ہے، فرقے تاریخِ اسلام میں اپنی گہری جڑوں کے ساتھ محو نہیں ہو سکتے۔ وہ صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ آئندہ بھی کسی نہ کسی صورت میں رہیں گے۔ اس حقیقتِ واقعی کا انکار اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔

یعنی بات یوں ہوئی کہ۔

(۱) اسلام میں فرقے قرآن کی رُو سے شرک ہیں۔

(۲) لیکن اُمت میں فرقے موجود ہیں اور صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔

(۳) یہ آئندہ بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہیں گے۔

لہٰذا اب ایسا اسلام تلاش کرنا جس میں شرک نہ ہو، حماقت ہے۔ ہمیں اسی قسم کے شرک آلود اسلام کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ اسلام کے مستقبل کی طرف سے کس قدر مایوسانہ تصور ہے! اگر حقیقت یہی ہے تو پھر یہ "اسلام، اسلام" کی رٹ کاہے کے لئے لگائی جا رہی ہے۔ بوریہ بستر باندھیئے اور اس قصۂ پارینہ کو ختم کیجئے۔

کتاب ایسی جس سے ہر قسم کے اختلافی احکام مل سکتے ہیں۔

سنتِ رسول اللہ وہ جو ابھی تک متعین ہی نہیں ہو سکی۔

فرقے جو قرآن کی رُو سے شرک ہیں مٹ سکتے ہی نہیں۔

اور اس کے بعد دعویٰ یہ کہ اسلام ہمارے لئے ہی نہیں، تمام نوعِ انسان کے لئے مکمل اور واحد نظامِ زندگی ہے! دنیا اس دعویٰ کو سن کر ہنسے گی نہیں تو اور کیا کرے گی۔

(۰)

فکر و نظر نے یہ کہا ہے کہ یہ متعین کرنے کے لئے کہ رسول اللہ نے قرآنی احکام پر کس طرح عمل کیا تھا، ایک لمبے چوڑے پروگرام کی ضرورت ہے۔ لیکن اسی سانس میں وہ بیجا کہتا ہے کہ

> کم و بیش انہی الفاظ میں مولانا عبید اللہ سندھی نے قرآن کے ساتھ ساتھ سنت کی ضرورت اور اہمیت

پر زور دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ قرآن ہی حقیقت میں اصل دین ہے۔ لیکن قرآن نے بعض چیزوں کا حکم دیا ہے اور بعض کے کرنے سے منع کیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ قرآن کے ان احکام پر عہد نبوت اور خلافت راشدہ کے زمانے میں کیسے کیسے عمل کیا گیا۔ مولانا کے نزدیک اس زمانے میں قرآن پر جس طرح عمل کیا گیا، اس کی تفصیلات ہمیں مؤطا امام مالک میں مل جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب یہ تمام تفاصیل مؤطا امام مالک میں مل جاتی ہیں، تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکتا جو قرآن کریم اور مؤطا امام مالک کے خلاف ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مؤطا امام مالک کی پوزیشن یہ ہے کہ اسے صحاح ستہ میں بھی شامل نہیں کیا گیا!

ضمناً — مدیر فکر و نظر (محترم محمد سرور صاحب) جنہوں نے یہ "نظرات" تحریر فرماتے ہیں، مولانا عبیداللہ سندھی کے خاص معتقدین میں سے ہیں اور ان کی فکر کے ناشر۔ سنت رسول اللہ کے متعلق مولانا سندھی کا نظریہ کیا تھا، وہ ذرا توجہ سے سن لیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے مطابق بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جمعیت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ خلافت عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں۔ سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہ اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے۔ اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے بائیلاز کہا جاتا ہے۔ اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائیلاز اُس وقت اور تھے اِس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضاءات کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے۔ (رسالہ الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص ۲۶۴)

کیا مدیر فکر و نظر کے نزدیک ان کے پیر و مرشد مولانا سندھی کا یہ مسلک انکارِ سنت ہے یا اقرارِ سنت؟ جو کچھ وہ مولانا سے مرحوم کے متعلق فیصلہ فرمائیں گے وہی فیصلہ طلوع اسلام پر منطبق ہوگا۔ اس لئے کہ طلوع اسلام کا موقف بھی یہی ہے اور اسلامی مملکت میں قانون سازی کے سلسلہ میں یہی تمام دشواریوں کا حل بھی۔ جہاں تک کتب احادیث کا تعلق ہے — یعنی اس پس منظر کا جس کی روشنی میں فکر و نظر قرآن کا مطالعہ کر کے عمل رسول اللہ

منتقل کرنا چاہتا ہے ـــ ان کی حیثیت مولانا سندھی ؒ کے نزدیک یہ ہے کہ۔

اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ ـــ صحیحین، ابوداؤد، ترمذی ـــ کے درجہ پر رکھ دیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۶۶)

یعنی ہماری کتبِ احادیث، اناجیل کی طرح ـ انسانوں کی مرتب کردہ کتبِ سیرت ہیں جن میں غلط اور صحیح مخلوط ہوتا ہے۔

(۰)

اصل یہ ہے کہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے اربابِ بست و کشاد ایک عجیب نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف ان کا جی ماڈرن بننے کو چاہتا ہے اور دوسری طرف مُلّا کا ڈر ان کے اعصاب پر سوار رہتا ہے اس سے ان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کوئی متعین، دو ٹوک بات کر ہی نہیں پاتے۔ ادارہ کے ڈائریکٹر، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے "سنتِ جاریہ" کی جو نئی اصطلاح وضع فرمائی تو اس پر مذہب پرست طبقہ نے انہیں منکرِ سنت قرار دے دیا۔ اس داغ کو دھونے کے لئے انہوں نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ طلوعِ اسلام کی مخالفت کی جائے تاکہ مُلّا انہیں اپنوں میں سے سمجھے ـــ غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را ـــ اور ان کے اس دوگونہ عذاب سے اسلام بچارے کی جو درگت بن رہی ہے وہ سب پر عیاں ہے۔

(۰)

آخر میں ہم مرکزی وزیرِ قانون محترم ایس۔ ایم ظفر صاحب سے (جو اس ادارہ کے چیئرمین بھی ہیں) ایک سوال براہِ راست دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ

اگر آج حکومت ایک ایسا قانون وضع کرتی ہے جس کا تعلق پرسنل لاز سے نہیں، اور اس قانون کو عدالت میں چیلنج کر دیا جاتا ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق نہیں اس لئے وہ غیر آئینی ہے۔ تو آپ کس طرح ثابت کریں گے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ہے؟ آپ اس کی تائید میں کونسی "سنت" پیش کرینگے اور اس کے "سنت" ہونے کی آپ کے پاس کیا دلیل ہوگی جس کا رد

فریق مخالف نہ کر سکے۔

ہم محترم موصوف سے عرض کرینگے کہ وہ اس سوال کو یونہی نظری (ACADEMIC) قرار دے کر نظر انداز نہ کر دیں۔ موجودہ دستورِ پاکستان کی رُو سے یہ سوال نظری نہیں، عملی ہے اور بڑا بنیادی۔ یہ سوال آج نہیں تو کل کسی نہ کسی وقت کسی عدالت کی طرف سے آپ کے پاس آئے گا۔ آپ کو (بحیثیت وزیرِ قانون) اس کا جواب دینا ہوگا۔ اگر آپ نے اِس وقت اپنے آپ کو اس سوال کے جواب کے لئے تیار نہ کر لیا تو اُس وقت دنیا کے سامنے ہمارے آئین اور اسلام کی جو تصویر آئے گی اور اس سے جو جگ ہنسائی ہوگی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اُس وقت آپ کی مشاورتی کونسل اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامی جس قسم کا (MATERIAL) آپ کو بہم پہنچائیگا اس کا اندازہ آپ فکر و نظر کے زیرِ تبصرہ "نظرات" سے لگا سکتے ہیں۔

آخر میں ہم پھر دہرا دیں کہ جب تک آپ آئینِ پاکستان میں اس کی تصریح نہ کر دیں کہ "سنت" کا متعین مفہوم کیا ہے اور وہ کس کتاب میں ملے گی، آئین میں اس شق کی موجودگی کہ ــــ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا ــــ ایک ایسا تعطل پیدا کر رہی ہے جس کی گرہ کشائی ناممکن ہے۔ یاد رکھئے! عملی مسائل کا حل، حقائق کا سامنا کرنے سے ملتا ہے۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر رکھنے (یا طلوعِ اسلام کو منکرِ سنت قرار دے دینے) سے ان کا حل نہیں مل سکتا۔ آپ سنت کا مفہوم متعین کریں اور اس کے ساتھ ہی کوئی ایسا ادارہ متعین کریں (مثلاً عدالت عالیہ) کہ کسی شخص کو مملکت کے کسی قانون کے کتاب و سنت کے مطابق ہونے میں شبہ ہو، تو وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر آخری فیصلہ لے لے۔ اس قسم کا فیصلہ خود طلوعِ اسلام کے نزدیک بھی قابلِ قبول ہوگا۔ یہی ایک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا قابلِ عمل نہج ہو سکتا ہے، نہ کہ وہ پریشانیٔ فکر و نظر جس کا مظاہرہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کرلیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ اسکے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائینگے وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپکو بھیج دی جائیگی۔ رسالہ طلوعِ اسلام کا چندہ بھی اسی سے وضع کر لیا جائے گا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

شہریوں کی بیچارگی

ہم اِس وقت اُن خار دار جھاڑیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جن میں سے ہر اُس شہری کو گزرنا پڑتا ہے جسے کسی سرکاری محکمہ سے کوئی واسطہ پڑے خواہ وہ حکومت کے خزانے میں روپیہ جمع کرانا ہی کیوں نہ ہو۔ ہم عمالِ حکومت کی ان بدعنوانیوں کا تذکرہ بھی نہیں چھیڑنا چاہتے جن کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان لوگوں کا احترام اٹھ رہا ہے۔ ہم ان بدمعاملگیوں کا رونا بھی نہیں رونا چاہتے جو ہمارے معاشرے کا عام چلن بن چکی ہیں۔ ہم اِس مہنگائی کی شکایت کرنے بھی نہیں بیٹھے جس کی وجہ سے، اب ہر شریف، سفید پوش کو زندگی کے دن گزارنے دوبھر ہو رہے ہیں ۔۔ ہم اس وقت صرف ان دو تین مشکلات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کا کوئی حل کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور اسی لئے لوگوں کے دلوں پر مایوسی چھا رہی ہے۔ اگرچہ ان مشکلات کا سامنا سارے باشندوں کو کرنا پڑ رہا ہے لیکن جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں اس کی بنیاد لاہور کا تجربہ ہے۔

(۱) پانی، زندگی کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ لیکن یہاں واٹر سپلائی کا یہ عالم ہے کہ اس شدت کی گرمی میں بعض اوقات لوگ قطرے قطرے کو ترس جاتے ہیں اور کبھی پانی آتا بھی ہے تو اس میں کیچڑ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ لوگ مسلسل چیخ و پکار کرتے ہیں لیکن صدا بصحرا۔

سپلائی کا تو یہ حال ہے لیکن بلوں کی کیفیت یہ ہے کہ بغیر کسی حساب کتاب اور مقدار و معیار کے سینکڑوں روپیہ کا بل صارف کو بھیج دیا جاتا ہے۔ بل پر یہ ہدایت لکھی ہوتی ہے کہ اگر آپ کو اس کے خلاف کوئی شکایت ہو، تو آپ پہلے بل کی ادائیگی کر دیں اور بعد میں اپنی شکایت فلاں افسر تک پہنچائیں۔ آپ بل کی ادائیگی کر کے اپنی شکایت متعلقہ افسر تک پہنچا دیتے ہیں لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوتا۔ آپ یاد دہانیاں کراتے ہیں لیکن بے سود۔ اتنے میں اگلا بل آ جاتا ہے اور اس پر بھی وہی ہدایت درج ہوتی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر آپ اس بل کی ادائیگی نہیں کرتے اور متعلقہ افسر کو لکھ بھیجتے ہیں کہ میری پہلی شکایت کا ازالہ نہیں کیا جاتا تو کم از کم اس کا جواب ہی دیجئے۔ تو ادھر سے اس کا جواب تو موصول ہوتا نہیں البتہ ایک صاحب آ دھمکتے ہیں کہ میں کنکشن کاٹنے آیا ہوں اب آپ کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ آپ اس بل کی نقد

ادائیگی کر دیں ـــــ اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان حالات میں یہ شہری بیچارہ کیا کرے؟

(۲) پانی کے بعد زندگی کی دوسری ضرورت بجلی ہے۔ بجلی کی آنکھ مچولی تو اب ایسا معمول ہو چکی ہے کہ اسکے خلاف شکایت کا احساس ہی مٹتا جا رہا ہے۔ لیکن مصیبت اس سے آگے چل کر آتی ہے۔ بجلی کی ناقص سپلائی کی وجہ سے، بجلی سے چلنے والا گھریلو سامان ـــ ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنر، ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، ہیٹر، استری وغیرہ سب جل جاتے ہیں اور مرمت کرنے والے ایک ایک نقص دور کرنے کا معاوضہ سینکڑوں روپے طلب کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ سب سامان کباڑ بن کر رہ جاتا ہے۔ شہریوں کی طرف سے چیخ و پکار ہوتی ہے لیکن کوئی سنتا ہی نہیں۔

اور لطف یہ کہ اگر بجلی کا بل وقت پر ادا نہ کیا جائے تو کنکشن کٹ جاتا ہے اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ۔

دل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں!

(۳) جن گھروں میں ٹیلی فون ہیں وہاں یہ مذاق حد سے گزر چکا ہے۔ ٹیلیفون آئے دن خراب ـــ "شکایت" کا ڈائل گھماتے رہیئے، کوئی جواب نہیں ملتا۔ اگر خوش قسمتی سے کہیں سے "لن ترانی" کی آواز آجائے اور آپ حرفِ شکایت زبان تک لے آئیں تو وہ آہِ نارسا بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ جو جی میں آئے کر لیجئے آپ کا ٹیلیفون ٹھیک نہیں ہوگا۔

اور اگر آپ اس کا بل وقت پر ادا نہیں کریں گے تو کنکشن کٹ جائے گا بلکہ اب تو یہ شکایت بھی عام ہونے لگی ہے کہ بل ادا ہو چکنے کے بعد بھی کنکشن کٹ جاتا ہے۔

(۴) یہی کیفیت پراپرٹی ٹیکس اور کارپوریشن ہاؤس ٹیکس کی ہے۔ جتنا ان کا جی چاہے طلب کر لیں۔ نہ ان کے بل میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ٹیکس کس حساب سے طلب کیا جا رہا ہے، نہ وہ یہ بتانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں کہ امسال، سالِ گزشتہ کی نسبت دُگنا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ چٹھیاں لکھتے رہیئے تو کوئی شنوائی نہیں۔ ٹیکس ادا نہ کیجئے تو ان کا ڈنڈا آپ کے سر پر موجود ہے۔

شہری بیچارے پر یہ سب کچھ بیتتی ہے لیکن اس کا مداوا کہیں سے نہیں ہوتا۔ جب کبھی (اسمبلی یا اخبارات میں) شور کی آواز زیادہ بلند ہو جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ پاور ہاؤس میں پانی ایسا آتا رہا جس میں ریت ملی ہوئی تھی اس لئے مشینیں خراب ہو گئیں۔ فلاں مقام پر کھمبے گر گئے اس لئے پاور سپلائی کے کنکشن منقطع ہو گئے۔ فلاں جگہ پائپ زنگ آلود ہو گئے اس لئے پانی میں کمی واقع ہو گئی۔ ٹیلیفون ایکسچینج کے کمروں میں گرمی کی زیادتی کی وجہ سے بیٹری سیل خراب ہو گئے۔ یعنی ان خرابیوں کا ذمہ دار کوئی انسان یا انسانوں کا گروہ

نہیں، مشینیں اور کھمبے ہیں، بیٹری کے سیل اور جنریٹر ہیں۔ ان محکموں میں جس قدر انسان ہیں، ان کا کام کنکشن کاٹنا ہے۔ اور بس! — کسی نے چارپائی بُنوانی تھی۔ اس نے پوچھا کہ کیوں بھائی! اس گاؤں میں کوئی بونا (چارپائی بُننے والا) بھی ہے؟ اس نے کہا کہ یہاں بونا تو کوئی نہیں۔ البتہ دو بھائی "اُدھیڑو" ضرور ہیں — ہمارے ان محکموں میں بونا کوئی نہیں ہوتا۔ سب "اُدھیڑو" بیٹھے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں بے بس شہری کیا کریں؟ کرنے کا کام ایک ہی ہے — لیکن قبل اس کے کہ یہ سوچا جائے کہ وہ کرنے کا کام کونسا ہے، پہلے یہ دیکھئے کہ اس وقت صورت حال کیا ہے؟ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ خرابیاں تو عام ہیں لیکن مشکل تنہا اس فرد کی سمجھی جاتی ہے جس پر وہ آن پڑتی ہے اور اُسی کو انفرادی طور پر اس کے ازالہ کے لئے بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ یوں سارا معاشرہ پریشانی میں مبتلا رہتا ہے لیکن ان پریشانیوں کے ازالہ کے لئے اجتماعی طور پر کچھ نہیں کیا جا رہا۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ ہر شہر میں، چیدہ چیدہ، ٹھنڈے دل و دماغ کے لوگ جو ان خرابیوں کی اصلاح کو اپنا مقصد قرار دے لیں، ایک سوسائٹی متشکل کریں۔ ان میں کوئی سیاسی آدمی (POLITICIAN) نہ ہو۔ وہ سوسائٹی نہ تو سیاسیات میں حصہ لے اور نہ ہی ہنگامے برپا کرے۔ نہایت خاموشی سے، آئین و ضوابط کے مطابق، متعلقہ محکموں کے ذمہ دار حضرات کے اس طرح پیچھے پڑ جائے کہ جب تک وہ ان خرابیوں کا ازالہ نہ کر دیں — یا کسی ایسے سبب کی اطمینان بخش نشاندہی نہ کر دیں جس کا دور کرنا اُن کے اختیار میں نہ ہو — انہیں ان سے اپنا دامن چھڑانا مشکل ہو جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہوگا کہ اس حقیقت کو ان حضرات کے ذہن نشین کرایا جائے کہ ان کا اور صارفین کا تعلق "حاکم اور رعایا" کا نہیں، دکاندار اور خریدار کا ہے۔ آپ شہریوں کے ہاتھوں ایک جنس بیچتے ہیں اور اس کی قیمت لیتے ہیں۔ اگر وہ جنس ناقص ہے تو آپ کو اس کی قیمت لینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ بلکہ ناقص سپلائی سے صارفین کا جو نقصان ہوتا ہے اس کا ہرجانہ ادا کرنے کے بھی آپ ذمہ دار ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے تو اس میں بھی تامل نہ کیا جائے۔

کیا لاہور میں کوئی اللہ کا بندہ اس مقصد کو لے کر اٹھنے کے لئے تیار ہے؟ اگر کوئی تیار نہیں تو پھر اس قوم کے لئے رونا ابدی طور پر مقدر ہو چکا ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت **خریداری نمبر** کا حوالہ ضرور دیا کریں!

ناظم

خورشید عالم

روس کا عالمی کردار ۲

کوئی ڈھائی سال پہلے، مارچ ۱۹۶۶ء میں "روس" کے عالمی کردار کا پہلی بار جائزہ لیا گیا تھا۔ بعد کی بعض نشستوں میں ضمنی طور پر پاور خلاء (فروری ۱۹۶۸ء) اور ہمہ مد (اپریل ۱۹۶۸ء) کے عالمی کرداروں کے مطالعہ کے سلسلے میں نمایاں طور پر روس کے کردار کا بھی جائزہ لیا گیا لیکن زمانہ اس طرح لحظہ بہ لحظہ دگرگوں ہو رہا ہے کہ روس کے سامنے ایک اور علیحدہ نشست ضروری ہو گئی ہے۔ روس یورپی انداز کی مملکت اور قلمرو تھا۔ اگر برطانیہ کی سلطنت پھیل کر ہمالیہ اور قراقرم کے سلسلہ ہائے کوہ تک نہ پہنچ چکی ہوتی تو اس برصغیر میں روس کے اثر و نفوذ اور غلبہ و تسلط کو روکنا ممکن نہ ہوتا۔ برطانیہ نے روس کا راستہ بڑی کامیابی سے روکا اور روکے رکھا۔ لیکن گردش روزگار نے ایسا پانسہ پلٹا ہے کہ برطانیہ پسپا ہو کر اپنے جزائر میں محدود ہوتا چلا جا رہا ہے اور روس اس کی جگہ لیتا جا رہا ہے۔ اس انقلاب ہیئت کے ذمہ دار برطانیہ اور روس کے داخلی حالات بھی ہیں اور عالمی سیاست کے خارجی حوادث بھی۔

انقلاب روس بیسویں صدی کا عظیم الشان اور یورپی تاریخ کا فقید المثال حادثہ ہے۔ اس کی نظیر ایک حد تک اٹھارھویں صدی انقلاب فرانس میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ذرا بہ نظر غائر دیکھا جائے تو روس کا تجربہ فرانس کے تجربے کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش آئند اور دور رس نتائج کا حامل لگتا ہے۔ فرانس نے "حریت، مساوات اور اخوت" کا جو خواب دیکھا تھا اس میں سلطانی جمہور کا پرتو خفیف طور پر ہی آ سکا تھا۔ اسے بھی شہنشاہیت کے جانشین آمروں نے برقرار نہ رہنے دیا۔ اور بعد میں آمریت کی جگہ جمہوریت نے لی تو منتخب حکمرانوں نے طرح استحصال کی ڈالی اور گیت سلطانی جمہور کے گاتے۔ جمہور بار برداری کے جانور جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اقوام یورپ نے جو کچھ بیرون خانہ کیا وہی کچھ اندرون در کیا۔ انہوں نے غیر یورپی اقوام مغلوبہ کو لوٹا تو اپنے ہاں بھی لوٹ ہی کا چلن رکھا۔ جمہور یورپ اپنوں کے ہاتھوں جس طرح لٹے یہ روح فرسا داستان ہے۔ مارکس روح جمہور کی کرب میں ڈوبی ہوئی بے تابو چیخ تھا۔ یہ چیخ روس کو گرما اور لرزا گئی۔ وہ عام روش سے ہٹ کر یورپ سے کٹ گیا اور

اپنے ہاں استحصال کا استیصال کرنے میں منہمک ہوگیا۔ مزاج اور مضمرات کے اعتبار سے روس کا تجربہ بڑا انقلابی تھا۔ اس کے ذریعے مشیت نے یورپ کو جتا دیا کہ جس استحصالی نظام کا وہ نقیب وعامل ہے وہ روحِ عصر کے نزدیک متروک اور شرفِ انسانیت کی رُو سے مردود ہے۔

یورپ نے فطرت کا یہ اشارہ قبول نہ کیا اور اپنی روش سے باز نہ آیا۔ روس سے وہ اچھوتوں کا سا سلوک کرنے لگا اور اس کی تضحیک و تذلیل کو اپنا معمول بنا لیا۔ روس بھی اپنے آپ میں ڈوب گیا اور گو اپنے ہاں اسے خون کے دریا میں سے ہو کر گذرنا پڑا تاہم وہ ابھرا تو اس نے یورپ کیا دنیا بھر کو یہ پیغام دیا ۔۔ لاسلاطین، لاکلیسا، لاالٰہ ۔۔ مارکس اور لینن کے افکار نظری اعتبار سے عالمی علمی حلقوں میں مطالعہ اور گفتگو کا موضوع بنتے چلے جا رہے تھے کہ روس میں انقلاب برپا ہوگیا۔ اپنے سامنے ان افکار کو متشکل ہوتا دیکھ کر دانشورانِ عالم کی توجہ اور دلچسپی ان میں نظری سے بڑھ کر عملی اور سیاسی ہو گئی۔ چنانچہ پہلے جو ممالکِ محروسہ کبھی انقلابِ فرانس کا نام لے کر ولولۂ حریت تازہ کرتے تھے یا ابھرتی ہوئی امریکی قوم کو دیکھ کر تائیدِ حوصلہ کے متمنی ہوتے تھے، ان کی نظریں روس کی طرف اٹھنے لگیں اور وہ اس کی مثال میں ایک نیا، امید افزا اور ولولہ انگیز سبق تلاش کرنے لگے۔ اس طرح جہاں ایک طرف روس کی تضحیک و تذلیل کے سامان ہونے لگے وہاں دوسری طرف اس کی تقلید اور قبولیت کے آثار ابھرنے لگے۔ اپنے قول و فعل سے روس نے اس میں کسی قسم کا شبہ نہ رہنے دیا کہ اشتراکی انقلاب کو وہ اپنی ذات تک محدود نہیں رکھے گا بلکہ ایک عالمی تحریک کے طور پر اسے دوسرے ممالک تک پہنچائے گا۔ اس کی واضح حکمتِ عملی یہ تھی کہ جب تک وہ سرمایہ دار ممالک سے گھرا رہے گا وہ اپنے ہاں بھی انقلاب کو پوری طرح کامیاب نہیں بنا سکے گا۔ اس سے یورپی خانوادہ بطورِ خاص متوحش ہوا، اور دولِ عظمیٰ پوری طرح کوشاں ہو گئیں کہ روسی انقلاب نتیجہ خیز نہ ہو اور بین الاقوامی میدان میں روس اکا بھی اور اشتراکی انقلاب کا بھی راستہ رُکے۔ انہوں نے طرح طرح کے جتن اور مکر کر دیکھے مگر روس کی آتشِ انقلاب فرو نہ ہو سکی اور اس کی تپش دوسرے ممالک میں محسوس ہونے لگی۔ اشتراکی روس غیر یورپی ممالک یعنی ترکی، ایران اور افغانستان سے ۱۹۲۱ء میں معاہداتِ دوستی کر لینے میں کامیاب ہوگیا، تو برطانیہ کو خصوصیت سے تشویش ہوئی۔ انیسویں صدی میں وہ انہی ممالک میں سیلِ روس کے سامنے بند باندھنے میں دیوانہ وار لگا رہا تھا۔ ان ممالک نے روسی اشتراکیت سے روابط پیدا کرنے شروع کئے تو برطانیہ کو اپنا اثر و اقتدار کم ہوتا دکھائی دیا۔

یہ پہلو روس سے دہری نفرت کا جواز تھا لیکن کاروباری پہلو نے دولتِ عظمیٰ برطانیہ کو روس سے راہ و رسم بڑھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ روس کی تجارت سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں برطانیہ اور روس کے مابین ایک تجارتی معاہدہ ہوا اور تجارت کے لئے ان میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ کوئی ایک سال بعد جرمنی جیسی

یورپی طاقت نے اپنے مصالح کے تحت ضرورت محسوس کی کہ روس سے میل جول بڑھایا جائے۔ یورپ ایسا دونوں کو حقارت سے دیکھا جاتا تھا اور یہی سلوک انکے باہمی میل جول کی اور وجہ بن گیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ دیواریں بوسیدہ ہو کے منہدم ہونے لگیں جو یورپ نے ازرہِ تعصب روس کے گرد کھڑی کر دی تھیں۔ جیسے جیسے یہ دیواریں معدوم ہوتی گئیں اشتراکیت برآمد ہو کر دوسرے ملکوں میں پہنچتی گئی۔ روس کے اندر جو کچھ ہوتا رہا، اور مخالفین روس اسے جس انداز سے دنیا میں پیش کرتے رہے اس سے روس کے اندر لامتناہی خلفشار کا پتہ چلتا تھا جس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان نہیں تھا کہ روس کوئی کارآمد نظم سیاسی و معاشی رائج کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے اور کسی ایسے راستے پر گامزن ہے جو اسے آگے ہی آگے لے جا رہا ہے۔ خود روس نے اپنے دروازے کم و بیش بند رکھے اور کوئی قابلِ ذکر مثبت معلومات بہم نہ پہنچائیں جن سے حقیقتِ حال کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ جو کچھ اس کی طرف سے سامنے آیا اسے اشتہار کی چنداں کامیاب کوشش قرار نہ دیا جا سکا۔

لیکن روس میں کیا ہوتا رہا، وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور اس کا اثر کتنی دور تک پہنچا، اسکا پتہ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران اور اسکے بعد چلا۔ جنگ کے خاتمے پر وہ برطانیہ اور امریکہ جیسی طاقتوں کے مقابلے کی طاقت تھا اور یورپ میں مشرقی جرمنی، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ اور البانیہ اشتراکی ہو کر مشرقی یعنی روسی یورپ کہلانے لگے۔ روس کا اثر یورپ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ایشیا میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ کئی ممالک میں اشتراکی گروہ یا افراد مصروفِ کار ہو گئے۔ روس کی عظیم الشان کامیابی چین کا اشتراکی انقلاب تھا جو ۱۹۴۹ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔ یہ کامیابی اس لحاظ سے اور اہم ہو گئی کہ چین میں روس اور امریکہ بالواسطہ لڑے اور امریکہ کے مقابلے میں روس فتح یاب ہوا۔ انقلابِ چین نے اس اصول کی بے پناہی کا ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کیا کہ جمہور بیدار و متحد ہو جائیں تو بڑی سے بڑی اندرونی یا بیرونی قوت ان کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ ۱۹۴۹ء کی اہمیت روس کے لئے دوگونہ ہے۔ اسی سال چین اشتراکی ہو گیا اور اشتراکی نظم مشرقی یورپ سے چین تک پھیل گئی۔ روس اس وسیع و عریض نظم کا قائد تھا۔ یہی وجہ امریکہ کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کم نہ تھی کہ روس نے ایٹم بم بنا کر امریکہ کی ایٹمی اجارہ داری بھی ختم کر دی۔ روس ۱۹۱۷ء کا اچھوت ۱۹۴۹ء میں دوسری عالمی قوت بن گیا تو اشتراکیت کی حقیقت اور توانائی کے قائل فوج در فوج دکھائی دینے لگے۔ یہ روس کی غیر معمولی کامیابی تھی کہ اشتراکیت سیاسی اعتبار سے امریکہ کے پائے کی عالمی قوت بن گئی۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۰ء تک روس نے اپنے اثر و رسوخ کو دور و نزدیک پھیلانے کے علاوہ معاشی اور عسکری طور پر جو ترقی کی اس نے ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اقوامِ متحدہ جیسے عالمی اداروں میں وہ ایسی موثر قوت تھا کہ اسکی تائید اور قبولیت کے بغیر کوئی فیصلہ ہو سکتا تھا نہ اس پر عملدرآمد۔ معاشی طور پر وہ اتنا ترقی کر گیا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار امریکہ کو للکارنے لگا۔ اور مسابقت سے نظامِ سرمایہ داری کو کہیں پیچھے چھوڑ جانے کی باتیں حتم و یقین سے کرنے لگا۔ عسکری طور پر وہ ایسے تباہ کن آلات تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ امریکہ کا پتّا پانی ہونے لگا۔ ۱۹۵۷ء میں جب اس نے اچانک مصنوعی سیارہ مدار میں پہنچا کر

خلا میں قدم رکھ دیا تو سرمایہ داری کے مقابلے میں اشتراکیت کے اصلح ہونے کی باتیں عام طور پر ہونے لگیں۔ روس کی ان محیر العقول ترقیوں نے امریکی صفوں میں افراتفری مچادی چنانچہ امریکہ کے حلیف اور اسکے پروردگان اسکے نکتہ چین بننے لگے۔ اور تو اور ایشیا میں پاکستان، ایران اور ترکی جیسے مغرب دوست بھی متزلزل ہو کر آزادانہ روش کا مظاہرہ کرنے لگے اور روس سے دوستانہ روابط قائم کرنے لگے۔

یوں تو جنگ کے دوران مشترک دشمن کے خلاف لڑتے ہوئے بھی روس اور اسکے مغربی حلیف آپس میں متحارب دکھائی دینے لگے تھے لیکن جنگ کے بعد تو وہ یقینی طور پر ایکدوسرے کے حریف بن گئے اور عالمی سیاست کا نقطۂ ماسکہ ان دو حریفوں کا ایک دوسرے کو زک پہنچانا ہو گیا۔ مغرب کی قیادت امریکہ نے سنبھال لی تو وہ روس کے خلاف ایک عالمی محاذ قائم کرنے میں لگ گیا۔ وہ مغرب میں یورپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے لگا تاکہ وہ اسکے پیچھے لگ کے روس کی ناکہ بندی کریں۔ مشرق میں وہ چین میں بالواسطہ روس سے متصادم ہوا اور بالآخر ناکام ہو کر چین سے بے دخل ہو گیا۔ اس شکست کے بعد وہ پہلے کوریا میں اور پھر ویٹ نام میں اس اشتراکیت کیخلاف لڑنے لگا جسکا نمائندہ پہلے وہ تنہا روس کو سمجھتا رہا اور اب چین کو سمجھتا ہے اسکے قدم کوریا میں نہ جم سکے اور اب ویٹ نام سے بھی اکھڑتے جا رہے ہیں۔ اس لئے امریکہ کی نظریں بھارت پر مرکوز ہوتی جا رہی ہیں، جیسا کہ ان صفحات میں بیان ہو چکا ہے، بھارت برہمنی ذہنیت سے مجبور امریکہ کا طفیلی اور کارندہ بنتا جا رہا ہے۔

لیکن اب صورت حال وہ نہیں جو انیسویں صدی میں تھی۔ اُس وقت برطانیہ دہلی میں بیٹھ کر روس کا راستہ روک سکتا تھا اور اس نے روکے بھی رکھا۔ اس کے مقابلے میں امریکہ آج دہلی میں پہنچکر روس کو روکنے پر قادر ہونے کی بجائے اسے بلانے پر مجبور ہے۔ حالات نے روس کو انیسویں صدی کا ہوا نہیں رہنے دیا بلکہ عظیم ہمسایہ بنا دیا ہے۔ یوں بھارت میں روس اور امریکہ بیک وقت ایکدوسرے کے حلیف بھی ہیں اور حریف بھی۔ یہ روس کی کامیابی اور اس کی سیاست کا کمال ہے کہ بھارت اور امریکہ اپنے اپنے مصالح اور اپنی اپنی فطرت کی بنا پر روس کو بلانے اور احترام سے بٹھانے پر مجبور ہیں۔ اب روس برصغیر میں مؤثر اور فیصلہ کن کردار بن گیا ہے۔ وہ کشمیر جیسے مسئلے کو برطانیہ اور امریکہ کی گرفت سے نکال کے تاشقند تک لے آیا ہے اور ایک فریق کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

جنگ کے بعد روس کے لئے اس طرح راستے صاف ہوئے ہیں کہ جہاں امریکہ جاتے وہاں روس بھی جا سکتا ہے، اور اس صفائی سے کہ اسے ناخواندہ نہیں سمجھا جاتا۔ کوریا، ویٹ نام اور بھارت میں دوست بنکر پہنچنے کے بعد اس نے بھی امریکہ کیطرح عالمی سمندروں کا رُخ کیا اور دیکھتے دیکھتے امریکہ کے مقابلے میں اپنی جگہ بنا لی۔ روس نے بحری قوت پر کوئی ایسی توجہ نہیں دی تھی۔ انقلاب سے پہلے اس کے لئے سمندری راستے کھلے بھی نہیں تھے۔ انقلاب کے بعد اس نے بری اور بحری راستوں کی بجائے ذہنوں کے راستے بیرون ملک پہنچنا شروع کیا۔ لیکن ایک عالمی قوت بننے کے بعد اسے بحری طاقت میں مناسب توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ چند سالوں میں وہ امریکہ کے مقابلے میں بحری قوت فراہم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

حالات نے اسے موقع بہم پہنچایا اور اس نے پیش بینی سے اس کا فائدہ اٹھایا۔ اب وہ تمام سمندروں میں موجود ہے اور پوری طاقت سے۔ اس کی موجودگی امریکہ کے لئے از حد پریشان کن ہے اور یہ کہنا غلط نہیں کہ امریکہ اور روس سمندر میں ایک طرح کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ روس سمندر کے متنوع پہلوؤں پر روز بروز زیادہ سے زیادہ حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ ایک امریکی امیر البحر کے الفاظ میں روس بحری قوت کی توسیع کے سلسلے سمندر کے عسکری، معاشی، سیاسی اور کاروباری پہلوؤں پر پوری طرح نظر رکھے ہوتے ہے اور اس کا روز افزوں استعمال کئے جا رہا ہے۔ اس کے سمندری بیڑے میں تجارتی اور ماہی گیر جہاز تک شامل ہیں اور وہ بھی عسکری فرائض سرانجام دیتے رہتے ہیں۔

روسی بیڑے سے کوئی سمندر خالی نہیں۔ مشرق بعید میں وہ کوریا کے آس پاس موجود ہے اور امریکہ کو کوریا کے خلاف مؤثر کارروائی کرنے سے روکے ہوتے ہے۔ پچھلے دنوں شمالی کوریا نے امریکہ کا "پوئبلو" جہاز پکڑ لیا تو روسی جہازوں نے درمیان میں آکر امریکی طیارہ بردار جہاز (انٹرپرائز) کو کسی قسم کا اقدام کئے بغیر واپس چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح امریکہ شمالی ویٹ نام کی بندرگاہ ہیفانگ کی نہ ناکہ بندی کر سکتا ہے نہ اس پر کسی قسم کا حملہ کر سکتا ہے۔ اس بندرگاہ میں روسی جہازوں کی ایک قطار لگی رہتی ہے اور وہ سامان جنگ مسلسل پہنچاتے رہتے ہیں۔ سنگاپور سے عدن تک کے افریشیائی سمندر میں بھی امریکہ تنہا نہیں رہا۔ یہاں بھی روس آپہنچا ہے۔ وہ عدن میں مراعات حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ ان مراعات کا حصول اس کے لئے ناممکن دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی نظر سنگاپور کے بحری مستقر پر بھی ہے اور وہ ابھی سے سنگاپور اور ملیشیا سے روابط بڑھا رہا ہے۔ انڈونیشیا سے ان دنوں روس کے تعلقات پہلے جیسے گرم جوشانہ نہیں لیکن روس اپنی بحری مصلحت کے پیش نظر انڈونیشیا کو تادیر نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ وہ بھارت کو بحری طاقت بنانے کے لئے دل کھول کر مدد دے رہا ہے۔ وہ در اصل اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ یہیں سے روس کے لئے بحری نقطہ نگاہ سے پاکستان کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

پاکستان کا تعلق خلیج بنگال سے بھی ہے، بحیرہ عرب سے بھی اور بحر افریشیا سے بھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ روس کو پاکستان کی خیر سگالی کی ضرورت ہے۔ دونوں ملکوں کے بڑھتے ہوئے تعلقات اس نکتہ کی قابل فہم تفسیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی بیڑے کے جہاز پچھلے دنوں کراچی بندرگاہ تک آئے اور روس نے پاکستان کو سامان جنگ تک مہیا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ روس اور بھارت کے دیرینہ تعلقات کے پس منظر میں یہ حیران کن ہے لیکن روس کے عالمی تقاضوں کے پیش نظر یہ بالکل قابل فہم ہے۔

روس کو پاکستان کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ اسے بحیرہ عرب، خلیج فارس، بحیرہ قلزم اور بحر متوسط جیسے مسلمان یا نیم مسلمان سمندروں میں موجود رہنے کے لئے اس کی تائید درکار ہے۔ روس کے سمندری مصالح ایسے ہو گئے ہیں کہ اسے عالم اسلامی کی متفقہ خیر سگالی کی ضرورت ہے۔ خلیج فارس اور بحیرہ قلزم اس کے لئے بڑے اہم ہو گئے ہیں۔ ان میں اسے موجود رہنا اور آتے جاتے رہنا ہو گا۔ ان ممالک کی وجہ سے وہ سارے مسلمان ممالک اس کے لئے اہم ہو گئے ہیں جو ان سمندروں

کے کنارے آباد ہیں۔ بحیرہ قلزم سے آگے بحیرہ متوسط ہے۔ وہاں جون ۱۹۶۷ء کی اسرائیلی جارحیت سے پہلے روس کے بمشکل پانچ چھ جہاز تھے۔ اب ان کی تعداد امریکہ کے چھوٹے بیڑے کے پچاس جہازوں کے لگ بھگ ہو گئی ہے۔ یہ سہولت اسے عربوں کی امداد کی بنا پر حاصل ہوئی ہے اور اسی بنا پر حاصل رہ سکتی ہے۔ اسی کی بدولت روس اٹلی اور یوگوسلاویہ کے درمیان ایڈریاٹک سمندر تک پہنچ گیا ہے۔ شمال میں بالٹک سمندر تو اس کی جھیل ہے اور وہاں اسے امریکہ پر نمایاں بالادستی حاصل ہے۔ ایڈریاٹک اور بالٹک سمندروں میں پہنچکر اس نے نیٹو کا بحری محاصرہ توڑ دیا ہے۔ ایک بحر الکاہل رہ جاتا ہے۔ اس میں روس کی موجودگی کا جواز کیوبا نے مہیا کر دیا ہے۔ کیوبا تک روس کی سمندری آمدورفت غیر منقطع طور پر جاری رہتی ہے۔ کیوبا کی بندرگاہوں میں روسی جہازوں کی آمدورفت سے امریکہ کے لئے کیوبا کے خلاف بحری کارروائی کا بہانہ تلاش کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔

گو کہنے کو یہی کہا جاتا ہے۔ اور اعداد و شمار سے اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ بحری طاقت میں روس دوسرے درجے پر ہے اور امریکہ پہلے درجے پر لیکن آج کی عالمی سیاست کی یہ حیران کن مگر بنیادی حقیقت ہے کہ روس کسی شمار و قطار میں نہ ہونے کے باوجود چند سالوں میں ہیبت ناک عالمی طاقت بن گیا ہے۔ اس کے جہاز نئے ہوئے بھی نئے ہیں اور ساخت کے اعتبار سے بھی جدید ترین قسم کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا کی کسی بندرگاہ میں جو بھی نیا جہاز نظر آئے اسے بآسانی روسی کہا جا سکتا ہے۔ روس کی اس حیرت انگیز ترقی کے دو پہلو قابلِ ذکر بھی ہیں اور قابلِ غور بھی۔ ایک امریکی بیانات کے مطابق روس ہر سمندر میں بھی اور اہم بندرگاہوں میں بھی امریکہ کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ وہ امریکی بیڑے کے تعاقب میں رہتا ہے، اسے آزماتا رہتا ہے اور پریشان کرتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ یہ جانچتا رہتا ہے کہ وہ خود کتنے پانی میں ہے اور امریکہ کتنے پانی میں ہے۔ اس کے علاوہ روس جا بجا دوست اور خواندہ سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس امریکہ ہر جگہ ناخواندہ سمجھا جاتا ہے۔

روسی بحری حیثیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کا واسطہ پورے عالم اسلامی سے نہیں تو عالمی اہمیت کے حامل مسلمان ممالک سے براہِ راست آپڑا ہے۔ انڈونیشیا سے الجزائر تک بلکہ شمال مغربی افریقہ کے انتہائی کناروں تک ایک ایک مسلمان ملک سے اس کا واسطہ پڑنے لگا ہے۔ ان ممالک کی ضرورت روز بروز اس کے لئے بڑھتی جائے گی اور وہ اپنی مصلحت کے تحت این دین کا مظاہرہ کرے گا۔ پاکستان، ایران اور ترکی سے اس کے تعلقات کی نوعیت میں بنیادی تبدیلی آچکی ہے۔ بھارت سے پرانی دوستی کے باوجود اور اس کے احتجاج کے علی الرغم روس پاکستان کو جنگی ساز و سامان دینے پر آگیا ہے۔ وہ پاکستان کی خاطر بھارت سے تعلقات کم نہیں کرے گا لیکن پاکستان سے معاملہ فہمی کا ثبوت ضرور دے گا۔ یہ ثبوت وہ دینے لگ گیا ہے اور اب اس سے آسانی سے انحراف نہیں کر سکے گا۔ یہ عالم اسلامی کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ زمانہ انہیں دعوت دے رہا ہے کہ وہ باہمی مشورے سے ایسی متفقہ اور

حقیقت پسندانہ حکمت عملی طے کریں جس سے ان کے عالمی اجتماعی مفاد کو فروغ ملے۔ ان کے اجتماعی مفاد ہی میں ان کا انفرادی مفاد ہے۔ ایسی حکمت عملی وضع کرنے میں انہیں روس، امریکہ، چین اور بھارت کے کردار کو خصوصیت سے پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہ کردار کیا ہیں، اس کا مطالعہ ان صفحات میں کیا جاچکا ہے۔

اس میں اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ روس دوسری بڑی عالمی طاقت ہے۔ اگر کہیں کہیں وہ امریکہ سے تھوڑا بہت پیچھے ہے تو کئی دوسرے میدانوں میں اس سے بہت آگے بھی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے استعماری کردار کے پیش نظر امریکہ کہیں بھی خواندہ نہیں سمجھا جارہا اور اس کے مقابلے میں روس کو جابجا ترجیح دی جارہی ہے لیکن گو امریکی استعمار پسپا ہوتا جارہا ہے، اور اس پسپائی میں روس کا نمایاں ہاتھ ہے، خود روس کی حیثیت کو بھی صدمہ پہنچنے لگا ہے۔ اشتراکی چال چلتے چلانے کے باوجود روس اپنی قومی چال نہیں بھول سکا۔ اشتراکیت کے زور پر اور اس کے نام سے حیران کن ترقی کر لینے کے بعد بھی اس کا کردار اشتراکی مملکت کا کم اور قومی مملکت کا زیادہ ہوگیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مشرقی یورپ میں قومی آزادی کی تحریک نتیجہ خیز ثابت ہوتی جارہی ہے۔ روس کو سب سے زیادہ ضعف چین سے پہنچا جو روس سے علیحدہ ہو کر اشتراکیت کا قائد بن گیا ہے۔ چین کا اب وہ مقام ہے جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس کا ہوگیا تھا۔ چین اشتراکی قیادت کا کس حد تک اہل ثابت ہوگا، یہ دیکھا جائے گا۔ لیکن روس اس مقام سے معزول ہو نہیں چکا تو ہوتا ضرور جارہا ہے۔ اسکی قیادت میں جو اشتراکی قلمرو قائم ہوئی تھی وہ بھی منتشر ہو نہیں گئی تو ہوتی ضرور جارہی ہے۔ یہ قلمرو آئندہ کیا رنگ اختیار کرے گی، یہ بھی دیکھنے کی بات ہے لیکن غالباً روس اس منصب سے ہمیشہ کے لئے بے دخل کیا جاچکا ہے اشتراکیت کے دعوے اور قومی کردار کے تضاد کو وہ کہاں تک نبھا سکے گا، اس پر قیاس آرائی قبل از وقت ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ مشیت نے یورپ میں جو کام انقلاب فرانس سے شروع کیا، اسے انقلاب روس سے آگے بڑھایا، اور اب وہ چین میں مصروف کار ہے۔ فرانس اور روس کی طرح چین بھی ایک سنگ میل ہوگا۔ منزل تو ابھی دور ہے۔ البتہ زمانہ منزل کا ہیولیٰ آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگ گیا ہے۔

(۔۔۔)

شاید آپ نہیں جانتے

کہ طلوع اسلام پاکستان کے علاوہ بیسیوں غیر ممالک میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس میں شائع شدہ اشتہارات یورپ اور امریکہ کے قارئین کی نظروں سے بھی گزرتے ہیں اگر آپ اپنی مصنوعات وغیرہ کو بیرونی ممالک میں روشناس کرانا چاہتے ہیں تو "طلوع اسلام" میں انکا اشتہار شائع کرائیں۔ آج ہی ایک کارڈ لکھ کر نرخ اشتہارات طلب فرمائیے۔ ناظم

سپاہی کی ذمہ داری

بدر کا میدان ہے۔ جماعتِ مومنین اور حق کے مخالفین کی پہلی جنگ ہے۔ جماعتِ مومنین میں وہ تین سو تیرہ نفوس شامل ہیں جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ حق کی مدافعت کے لئے شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں آ گئے ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے متعلق، اس فوج کے سپہ سالار حضور نبی اکرمؐ ابھی ابھی نہایت والہانہ انداز سے بحضور رب العزت عرض کر چکے ہیں کہ

بار الہا! یہ بے ساز و سامان مجاہدوں کی مٹھی بھر جماعت حق کی حفاظت کیلئے اس میدان میں نکل آئی ہے۔ اگر یہ آج ختم ہو گئی تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہیگا۔

یہ ہے اس جماعت کے سپاہیوں کا مقام اور یہ ہے ان کا ایمان لیکن اس کے باوجود عین میدان جنگ میں خدا کی آواز ان سے کہتی ہے کہ

وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۸/۱۶﴾

یاد رکھو! آج کے دن جس نے میدان میں پیٹھ دکھا دی — بجز اس کے کہ وہ لڑائی کی کسی ضرورت کے لئے پینترا بدلے یا اپنے لوگوں کے ساتھ ملنے کے لئے ایسا کرے — تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا کا غضب اُس پر نازل ہو جائے گا۔ وہ سیدھا جہنم میں جائے گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں حق کی خاطر لڑنے والے سپاہی کا مقام اتنا بلند ہے کہ وہ جان دیدیتا ہے تو شہید کہلاتا ہے، اور فاتح و منصور لوٹتا ہے تو غازی بنتا ہے، وہاں اس کی ذمہ داری کا یہ عالم ہے کہ وہ اگر میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتا ہے تو وہ سیدھا جہنم رسید ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ "بال سے باریک اور تلوار سے تیز پل صراط" جس پر سے مسلمان سپاہی کو گزرنا پڑتا ہے اور لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا!

(ب۔ ن)

بابُ المراسلات

۱۔ جمہوریت اور اقامتِ دین

طلوع اسلام کی سابقہ (ماہ جولائی کی) اشاعت کے لمعات میں، ہم نے بتایا تھا کہ مودودی صاحب، جو اب جمہوریت کو عین اسلام بتاتے ہیں، اس سے پہلے اسے کسطرح اسلام کی نقیض قرار دیا کرتے تھے۔ اس نقاب کشائی سے جماعتِ اسلامی سے متعلقین کا تلملا اٹھنا قابلِ فہم ہے۔ چنانچہ اس جرم کی پاداش میں ہمیں (جیسا کہ ان "صالحین" کا شیوہ ہے) ہدفِ سب و شتم بھی بنایا گیا ہے اور موردِ طعن و تشنیع بھی۔ ہمیں اس پر کوئی گلہ نہیں ـــ اگر بچو آپ کو ڈنک مارے تو کیا آپ اسے گالیاں دینے لگ جائینگے؟ ـــ لیکن ایک بات ایسی ہے جس کا جواب دیا جانا ضروری ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ایک صاحبِ فکر کی رائے بدلتی رہتی ہے۔ اُس وقت مودودی صاحب کا جمہوریت سے متعلق وہی خیال تھا۔ اب انہوں نے مزید غور و فکر کے بعد اپنی پہلی رائے بدل لی ہے۔ اس میں کیا قباحت ہے گفتگو اس بات پر ہونی چاہیئے کہ اب جو وہ کہہ رہے ہیں کہ جمہوریت عین مطابقِ اسلام ہے تو اس پر کیا اعتراض ہے؟

طلوعِ اسلام

اس میں کوئی کلام نہیں (اور نہ ہی اس پر کسی کو کوئی اعتراض ہونا چاہیئے) کہ ایک صاحبِ فکر مزید غور و فکر اور تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر اپنی کسی سابقہ رائے کو بدل سکتا ہے لیکن دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تسلیم کرے کہ اس کی پہلی رائے غلط تھی۔ اب اس نے اُس سے رجوع کر لیا ہے۔

لیکن مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آج ایک بات کہتے ہیں اور نہایت حتم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں وہ عین مطابقِ شریعت ہے۔ لیکن اس کے بعد اس بات کے بالکل برعکس دوسری بات کہتے ہیں اور اس کے متعلق بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بھی عین مطابقِ شریعت ہے۔ انھوں نے آج تک اپنی کسی روش کے متعلق یہ نہیں کہا کہ وہ خلافِ شریعت تھی اور اب جو میں نے اس میں تبدیلی کی ہے تو یہ مطابقِ شریعت ہے۔ ان کی ساری زندگی اس قسم کے تضادات سے بھری پڑی ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ ان باہمد گر متضاد باتوں میں سے

ہرایک کو مطابق شریعت بتاتے ہیں ـــــ پاکستان کا تصور اور مطالبہ یکسر خلافِ اسلام ـــ پاکستان کا حصول عین مطابقِ اسلام ـــ انتخابات میں حصہ لینا اور بطورِ امیدوار کھڑے ہونا یکسر خلافِ اسلام' اور انتخابات لڑنا اور رکنیت کے لئے اپنے امیدوار کھڑے کرنا عین مطابقِ اسلام ـــ اُمت کے اندر پارٹیاں بنانا یکسر خلافِ اسلام اور اس کے بعد اپنی پارٹی بنالینا عین تقاضائے اسلام ـــ عورت کا ووٹ تک دینا خلافِ اسلام' اور عورت کو منصبِ صدارت کے لئے امیدوار بنانا اور اس کی کامیابی کے لئے جدوجہد کرنا عین مطابقِ اسلام ـــ ویٹو کا استعمال یکسر خلافِ اسلام' اور امیر جماعت کا' ویٹو کا استعمال یکسر مطابقِ شریعت ـــ جمہوریت یکسر اسلام کی ضد اور جمہوریت عین مطابقِ اسلام ـــ غرضیکہ ہم کہاں تک گناتے جائیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم ان کے تضادات کے متعلق تفصیل سے لکھیں گے اور بتائیں گے کہ ان کا اسلام کس طرح ان کی مصلحتوں کے تابع آئے دن رنگ بدلتا رہتا ہے ہمیں اعتراض اس پر نہیں کہ مودودی صاحب اپنی رائے یا روش کیوں بدلتے ہیں' اعتراض اس پر ہے کہ وہ اپنی ہر متضاد روش کو عین مطابقِ اسلام قرار دے کر عوام کو دھوکا کیوں دیتے ہیں!

اب آیئے جمہوریت کی طرف۔ جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ ملک کی آبادی کی اکثریت (اپنے نمائندوں کی وساطت سے) جو فیصلہ کرے اسے ملک کا قانون تسلیم کر لیا جائے۔ مودودی صاحب نے موجودہ قوم کے متعلق کہا یہ ہے کہ ان میں ہزار میں سے (۹۹۹) علم سے بے بہرہ' سیاسی شعور سے بیگانہ' اسلامی تعلیم سے ناآشنا ہیں۔ جتنے عیوب کافروں میں ہوتے ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں۔ یہ ہے قوم کی حالت۔ اس قوم کے نمائندوں کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ جس قسم کا دودھ ہوگا اس میں سے اسی قسم کا مکھن نکلے گا۔ دودھ اگر زہریلا ہے تو اس میں سے مکھن بھی زہریلا ہی نکلے گا۔

یہ ہوں گے وہ نمائندگانِ قوم جن کی اکثریت کے فیصلے' ملک کا قانون قرار پائیں گے۔ اس کے متعلق خود مودودی صاحب فرما چکے ہیں کہ "اس قسم کی حکومت' مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی' بلکہ اس سے بھی بدتر"۔

ہم مودودی صاحب کے ہمنوا حضرات سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا وہ اس قسم کے نظامِ سیاست کو اسلامی تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں؟

کہا یہ جاتا ہے کہ جب آئین میں یہ شق موجود ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب وسنت" کے خلاف نہیں ہوگا' تو پھر ایسی صورت پیدا نہیں ہو سکتی کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ ہو جائے جو اسلام کے خلاف ہو۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جب ملک کے قوانین کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ "کتاب وسنت" کے خلاف نہ ہوں' تو اس کے لئے اکثریت اور اقلیت (فلہذا نظامِ جمہوری) کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟ فرض کیجئے کہ ایک

مجوزہ قانون کتاب وسنت کے مطابق ہے لیکن مجلس قوانین ساز کی اکثریت اس کے حق میں رائے نہیں دیتی، تو کیا وہ قانون ملک میں نافذ ہو سکے گا یا نہیں۔ یا (۲) اس کے برعکس، ایک قانون کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ اور اکثریت اس کے حق میں رائے دیتی ہے، تو اس صورت میں اس قانون کی حیثیت کیا ہو گی؟

بادیٔ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس جمہوریت کو عین مطابق اسلام قرار دیا جا رہا ہے' وہ جمہوریت اس ملک میں بار پا ہی نہیں سکتی جس میں بنیادی (آئینی) شرط یہ ہو کہ کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہو گا۔ اس شرط کی رُو سے تو کیفیت یہ ہو گی کہ اگر کوئی قانون کتاب وسنت کے مطابق ہے تو وہ ملک کا قانون بن جائے گا خواہ اس کے حق میں ایک ووٹ بھی نہ ہو۔ اور جو کتاب وسنت کے خلاف ہو گا وہ ملک کا قانون بن نہیں سکے گا خواہ اس کی تائید میں، سو فیصد ووٹ بھی کیوں نہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو جماعت' اقامتِ دین کی مدعی بن کر اُٹھے' وہ جمہوریت کی آواز بلند کر ہی نہیں سکتی۔ اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں اس وقت دینی نظام موجود نہیں ۔ یعنی قوم، یا اس کی اکثریت غیر دینی روش پر گامزن ہے ۔ ان حالات میں' اس قوم میں دینی نظام نافذ کرنے کے کی جدوجہد کے لئے ضروری ہو گا کہ آپ قوم کی اکثریت کی مخالفت کریں۔ لیکن جمہوریت میں کامیابی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کی اکثریت آپ کے ساتھ ہو۔ اگر آپ نے اس کی اکثریت کو اپنے ساتھ رکھنا ہے تو آپ انکی مخالفت نہیں کر سکتے اور اگر آپ ان کی مخالفت کرتے ہیں تو وہ آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے ۔ جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کا دعوےٰ بھی کرتی ہے اور قوم کی اکثریت کے ووٹ بھی حاصل کرنا چاہتی ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک ہی چیز ممکن ہے ۔ بنا بریں' اس جماعت کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگ زبان سے اقامتِ دین کا دعوےٰ کرتے ہیں' لیکن قوم کی اکثریت جس طوفان میں بہے جا رہی ہے' یہ اس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہیں گے۔ ان کی ساری مخالفت حکومت کے فیصلوں یا اقدامات کی ہو گی۔ آپ ذرا ان نقاط پہ غور کیجئے ۔

(۱) اس وقت جو کچھ مزاروں اور خانقاہوں پر ہو رہا ہے' جماعت اسلامی والوں سے پوچھئے کہ کیا یہ اسلام کے مطابق ہے؟ وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ شریعت کے مطابق ہے ۔ تو اس کے بعد آپ ان سے پوچھئے کہ کیا آپ نے ان کے خلاف کوئی مہم جاری کی ہے؟ یہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے اکثریت کے ووٹ ہاتھ سے جاتے ہیں۔

(۲) ان سے پوچھئے کہ ملک میں مختلف فرقے جن امور پر باہمی سر پھٹول کرتے رہتے ہیں' کیا یہ اسلام کے مطابق ہے؟ اور اگر یہ اسلام کے مطابق نہیں' تو آپ نے ان کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہے؟ یہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے ووٹ ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔

(۳) ان سے پوچھئے کہ ملک میں فحش کاری، قمار بازی، سٹہ، شراب خوری وغیرہ کا جو سیلاب امنڈ رہا ہے، اس کی روک تھام کے لئے آپ نے کوئی مہم جاری کی ہے؟ یہ ان امور کے متعلق حکومت کو تو اٹھتے بیٹھتے کوستے رہیں گے، لیکن خود اس کے خلاف انگلی تک نہیں اٹھائیں گے۔ کیونکہ اس کا اثر آنے والے انتخابات پر پڑے گا۔

(۴) یہ لوگ ملک میں بے کاری، بے روزگاری، مفلسی، محتاجی وغیرہ کے لئے حکومت کو موردِ الزام قرار دیتے چلے جائینگے، لیکن جن سرمایہ داروں، کارخانہ داروں، زمینداروں کی وجہ سے عوام کی یہ حالت ہو رہی ہے، ان کے خلاف لب تک نہیں ہلائیں گے کہ اس سے ان کی آمدنی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، ان کا سارا زور نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابقِ اسلام ثابت کرنے میں صرف ہوگا۔

(۵) ملک میں رشوت ستانی، چور بازاری، سمگلنگ، آبیزش وغیرہ جیسی انسانیت سوز خرابیاں عام ہو رہی ہیں۔ کیا اس جماعت نے اس کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا؟ یہ ایسا کر نہیں سکتی کیونکہ اس سے ملک کے بااثر طبقہ سے مخالفت مول لینی پڑتی ہے۔ ان کے خلاف محاذ قائم کرنا تو ایک طرف، پچھلے دنوں حکومت نے غنڈوں اور دیگر قانون شکن عناصر کے خلاف جو اقدامات کئے ہیں، اس جماعت کی طرف سے ان کی بھی دل کھول کر حمایت نہیں کی گئی۔ اس لئے کہ ان عناصر کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تائید، بڑی موجبِ تقویت ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں یہ حضرات کہہ دیا کرتے ہیں کہ معاشرہ میں ان خرابیوں کی روک تھام کے لئے اقتدار کی ضرورت ہے جس کے لئے ہم کوشاں ہیں۔ اقتدار حاصل ہونے کے بعد ہم ان سب کی اصلاح کر لیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا معاشرہ کی کوئی خرابی ایسی نہیں جس کی اصلاح اقتدار کے بغیر کی جا سکے؟ جب یہ جماعت، اقتدار کے بغیر عائلی قوانین، یا خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے خلاف اس قدر جد و جہد کر سکتی ہے۔ جب یہ سوشلزم کے خلاف، اپنے مجلات کے ضخیم سے ضخیم نمبر نکالتی رہتی اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کی روک تھام کی تدبیریں کرتی رہتی ہے، تو معاشرہ کی عام خرابیوں کی اصلاح کے لئے مناسب اقدامات کیوں نہیں کر سکتی؟ یہ ایسا کر تو سکتی ہے لیکن جمہوریت (ووٹ حاصل کرنے) کا تصور انہیں کوئی ایسا قدم اٹھانے نہیں دیتا جس سے یہ اکثریت میں (UN - POPULAR) ہو جائیں۔ اس کے برعکس یہ سستی شہرت (CHEAP - POPULARITY) حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کر لیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جو جماعت، دیانتداری سے اقامتِ دین کا دعوے لے کر اٹھے، وہ جمہوریت کا مسلک اختیار کر ہی نہیں سکتی۔ اور جو جمہوریت کو اپنا مسلک قرار دے، اس کا اقامتِ دین کا دعوے ایک مقدس فریب سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ جس نے لوگوں سے ووٹ لینے ہوں وہ ان کی خرابیوں پر انہیں مطعون کیسے کر سکتا ہے؟ آپ کسی محلہ یا برادری کی خرابیاں گنا دیجئے اور اس کے بعد وہیں سے امیدوار بن کر اٹھئے۔ نتیجہ آپ کے

سامنے آجائے گا۔ آپ جمہوریت میں اکثریت کو ناراض کر ہی نہیں سکتے۔ اور جب اکثریت کو ناراض نہیں کر سکتے تو معاشرہ کی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں! یہی وجہ ہے کہ بہتر سے بہتر جمہوری نظام میں بھی، ملک مادی اسباب و وسائل کے لحاظ سے تو ترقی کرتا جائے گا لیکن انسانی سیرت پست سے پست تر ہوتی چلی جائے گی۔ انسانی سیرت میں اصلاح صرف قرآنی نظام کر سکتا ہے جس میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ خدا کے احکام و قوانین کیا کہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اکثریت کیا چاہتی ہے۔ غلط معاشرہ کی یہی وہ اکثریت ہے جس کے متعلق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا تھا کہ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (۶/۱۱۶) اگر تو اہل ملک (یا زمین) کی اکثریت کی اطاعت کرے گا تو وہ تجھے خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ جماعت اسلامی کی جمہوریت کی مہم اسلام کے تقاضا اور اقامت دین کے دعوے کے مطابق ہے؟

(۱)

۲۔ انشورنس

جوں جوں معاشی تقاضے بڑھتے جاتے ہیں، اس قسم کے استفسارات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے کہ بینک کا سود جائز ہے یا ناجائز، زمین بٹائی پر دی جا سکتی ہے یا نہیں، روپیہ لگا کر منافع میں حصہ دار بننا کیسا ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ کا منافع لیا جا سکتا ہے یا نہیں، انشورنس جائز ہے یا نہیں۔ ہم وقتاً فوقتاً ان استفسارات کا جواب ان صفحات میں دیتے رہتے ہیں اور قرآن کے معاشی نظام کے متعلق اپنی کتاب ——— خدا اور سرمایہ دار ——— میں تفصیلی بحث بھی کر چکے ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں انشورنس کے متعلق دو تین استفسارات موصول ہوئے ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ اس پر متعین طور پر لکھا جائے۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل متعدد بار لکھ چکے ہیں، بات بینک کے سود، مضاربت، مزارعت، انشورنس وغیرہ کی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام ہی غیر قرآنی ہے اور ہم چاہتے یہ ہیں کہ کسی طرح اس غیر اسلامی نظام میں "اسلام" کا پیوند لگا کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیں۔ یہ اطمینان، فریب نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کوئی غیر اسلامی نظام، پیوند سازی سے اسلامی نہیں بن سکتا۔ لہٰذا، غیر اسلامی نظام معیشت کو علی حالہ رکھتے ہوئے، اس قسم کی بحثیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ اگر قرآن کا معاشی نظام قائم ہو جائے تو اس میں، ان میں سے کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوگا۔ آج ان سوالات کی نوعیت اسی قسم کی سمجھئے جیسے (مثلاً) ایک کمیونسٹ، نظام سرمایہ داری کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے پوچھے کہ میں ذاتی جائیداد بنا سکتا ہوں یا نہیں۔

آپ انشورنس ہی کو لیجئے۔ اس کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ایک شخص سوچتا ہے کہ اگر کل کو اسے کوئی حادثہ گذر جائے تو اس کا (یا اس کی موت کے بعد اس کے بچوں کا) کیا بنے گا؟ قرآن کے معاشی نظام میں کسی شخص کو اس قسم کا خطرہ لاحق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نظام میں ہر ذی حیات کے سامانِ زیست (بنیادی ضروریاتِ زندگی) بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اس لئے اگر کوئی شخص کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو جائے تو اسے اس کی فکر ہی نہیں ہوگی کہ وہ کھائے گا کہاں سے ؟ یا اگر وہ وفات پا جائے تو اس کے بچوں کا کیا بنے گا؟ لہٰذا اس نظام میں انشورنس کی نہ ضرورت لاحق ہوتی ہے' نہ ہی اس کے جائز اور ناجائز ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ہر فرد اپنی اور اپنے بیوی بچوں کے مستقبل کے متعلق ہر طرح سے (ASSURED) ہوتا ہے۔

لیکن آج (غیر اسلامی نظامِ معیشت میں) صورت یہ ہے کہ اگر کوئی فردِ کاسب کسی وجہ سے کام کاج کرنے سے معذور ہو جاتا ہے' یا اس کی موت ایسے حالات میں ہو جاتی ہے کہ اس کے پاس اثاثہ کوئی نہیں ہوتا' تو وہ خود (اور اس کے بیوی بچے) نانِ شبینہ تک کے محتاج ہو جاتے ہیں اور ان بیچاروں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ غیر قرآنی نظامِ معیشت (یعنی نظامِ سرمایہ داری) میں اس صورت حال سے بچنے کے لئے انشورنس کی اسکیم رائج کی گئی۔ اس سے بہر حال' اس قسم کے واقعات میں' زندگی کے دن بسر کرنے کے لئے ایک سہارا مل جاتا ہے۔ اندریں حالات' موجودہ نظام میں' اس اسکیم کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ لیکن

شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

یعنی یہ حضرات (ہمارے مذہبی پیشوا) بجائے اس کے کہ موجودہ نظام کو حرام قرار دیں' اس کے اندر اس قسم کی سہولتوں کو حرام قرار دیدیتے ہیں۔ اور جب پوچھا جائے کہ صاحب! اگر یہ شخص انشورنس نہ کرائے اور کل کو اس پر اس قسم کا حادثہ گذر جائے تو اس کا اور اس کے بال بچوں کا کیا بنے گا' تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بتانا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام تو فتویٰ دینا ہے۔ یہی سوال قرآن کریم نے بھی اٹھایا تھا جب کہا تھا کہ

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۲/۲۶۶)

کیا تم میں سے کوئی شخص بھی یہ چاہے گا کہ

(۱) اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا سرسبز و شاداب باغ ہو جس میں پھل بکثرت آئیں۔

(۲) وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔
(۳) کہ ایسے میں ایسی بادِ سموم چلے کہ اس باغ کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے (اور اس طرح وہ پورے کا پورا کنبہ سامانِ زیست سے محروم رہ جائے)
(۴) کیا تم میں سے کوئی بھی چاہے گا کہ اس کی ایسی حالت ہو جائے؟ اگر ایسا نہیں چاہتے تو پھر فکر و تدبر کی رُو سے دیکھو کہ وہ کونسا قدم اٹھایا جائے جس میں ایسی صورت پیدا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں چاہے گا۔ قرآن نے اس کا اعتراف کرانے کے بعد (کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں چاہے گا) کہا کہ پھر تم ایسی آفت سے بچنے کا انتظام کیوں نہیں کرتے! اور وہ انتظام یہ ہے کہ تم قرآن کا تجویز کردہ معاشی نظام اپنے ہاں رائج کر لو۔ اس نظام میں کبھی ایسی شکل پیدا نہیں ہو گی۔

قرآن کریم نے اس کا یہ حل بتایا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا نظام قائم کر کے دکھا دیا کہ یہی ان مشکلات کا قرار واقعی حل ہے۔

وہ نظام باقی نہ رہا اور دنیا میں نظامِ سرمایہ داری کا چلن عام ہو گیا۔ اس نظام میں بھی وہی سوال سامنے آیا۔ جسے قرآن سامنے لایا تھا۔ اس نظام کے حاملین نے اس کا حل انشورنس کی صورت میں تجویز کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حل ویسا نہیں جیسا قرآن کریم نے تجویز کیا تھا، لیکن موجودہ غلط نظام میں یہ حل، متبادل حل نہ ہونے تک، بہرحال غنیمت ہے، اور دنیا اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں قرآنی حل رائج نہیں کرتے، اور دنیا نے جو حل تجویز کیا ہے اسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

قرآن نے (مندرجہ بالا آیت میں) کہا تھا کہ تم سوچو کہ تمہیں کیا انتظام کرنا چاہیئے جس سے ایسی صورت پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ شریعت کے معاملہ میں سوچنا حرام ہے۔

انشورنس کو ناجائز قرار دینے کے لئے، ان حضرات کی طرف سے دو دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ چیز "توکل علی اللہ" کے خلاف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں سود شامل ہوتا ہے۔

جہاں تک "توکل علی اللہ" کا تعلق ہے، ان حضرات نے توکل کا ایسا غلط مفہوم پیش کر رکھا ہے جس سے یہ قوم اپاہجوں اور مفلوجوں کا گروہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان کے پیش کردہ توکل علی اللہ کے مفہوم کی تردید تو روزمرہ کے واقعات کر رہے ہیں۔ اگر توکل علی اللہ سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے لئے کوئی حفاظتی تدبیر نہ کرو کیونکہ رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے، تو ان سے پوچھیئے کہ یہ جو اس وقت دنیا کی آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے اور ایک ایک قحط میں لاکھوں انسان بھوک سے مر جاتے ہیں یا فرد کا سب کی موت کے بعد اس کے بیوی بچوں پر فاقے آنے شروع ہو جاتے ہیں، تو اس وقت خدا کی یہ ذمہ داری کہاں چلی جاتی ہے؟

یاد رکھیئے! توکل علی اللہ کے یہ معنی نہیں۔ اس کے معنی ہیں خدا کے تجویز کردہ نظام کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد۔ یہ بھروسہ کہ اس نظام میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی ذی حیات بھوکا رہ جائے۔ یہ اسی نظام کی محکمیت تھی جس کے پیشِ نظر حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ

> اگر کسی بستی میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو جائے تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

یا جس کی "ذمہ داری" کی حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں تشریح کی تھی کہ

> اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو بخدا! عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔

یہ تھا وہ نظام جس پر کامل بھروسہ کو "توکل علی اللہ" کہا گیا تھا۔

باقی رہا سود کا معاملہ — سو ان حضرات سے پوچھیئے کہ آپ لوگوں سے "کارِ خیر" کے لئے جس قدر عطیات لیتے ہیں (حتیٰ کہ جس وظیفہ یا تنخواہ پر آپ کی بسر اوقات ہوتی ہے) کبھی سوچا بھی ہے کہ اس میں کس قدر حصہ سود کا ہوتا ہے؟ سود، موجودہ نظامِ سرمایہ داری کا خونِ رگِ حیات ہے۔ اس سے (اس نظام میں زندگی بسر کرنے والوں میں سے) کس کو مفر ہو سکتا ہے؟

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ نظامِ معیشت سراسر غیر اسلامی ہے۔ اور سود، انشورنس وغیرہ قسم کی اسکیمیں اس نظام کا لازمی جزو ہیں۔ لہٰذا، جب تک آپ اس نظام کو گوارا کئے ہوئے ہیں، آپ کو اس شجرۃ الذقوم کے برگ و بار کو بھی گوارا کرنا ہو گا۔

اور اگر آپ انہیں گوارا نہیں کر سکتے اور رزقِ حلال کے متمنی ہیں تو اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ، قرآنی نظامِ معیشت رائج کریں۔ لیکن اگر ہماری روش یہی رہی کہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری کو تو عین مطابقِ اسلام قرار دیتے رہے اور اس کے برگ و بار کو حرام۔ (اور قرآنی نظام کی طرف دعوت دینے والوں کو کمیونسٹ ٹھہرا کر مطعون کرتے رہے) تو یہ فریبِ نفس ہے جس سے عملی مشکلات کا حل نہیں مل سکتا۔

اطلاع

رسالہ طلوعِ اسلام ہر ماہ کی یکم تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ کو پرچہ نہ ملے تو اسکی اطلاع اس مہینہ کی پندرہ تاریخ تک ادارہ کو پہنچ جانی چاہیئے۔ آپکو دوبارہ پرچہ ارسال کیا جائے گا۔ بعد میں پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

(ناظم)

علامہ تمنا عمادی مدظلہٗ

ہماری تاریخ

علامہ ابن جریر طبری

(۱)

طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۶۷ء میں "تاریخ طبری" کے عنوان سے، علامہ تمنا عمادی کا ایک مختصر سا مقالہ شائع ہوا تھا جس کے تعارف میں ہم نے حسب ذیل شذرہ لکھا تھا:-

"تاریخ اسلام کی قدیم ترین کتاب" امام ابن جریر طبری کی تاریخ ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی مبسوط تاریخ لکھی اور قرآن کریم کی سب سے پہلی تفسیر بھی۔ لہٰذا، ان کی تاریخ کی کتاب "ام التواریخ" اور ان کی تفسیر "ام التفاسیر" کہلاتی ہے۔ بعد میں آنے والے مؤرخین اور مفسرین، سب انہی سے نقل کرتے ہیں۔ لہٰذا، طبری کی تاریخ، مسلمانوں کی تاریخ کا اولین ماخذ ہے۔ امام ابن جریر طبری، طبرستان کے رہنے والے ایک شیعہ اہل قلم تھے لیکن سُنّی کی حیثیت سے متعارف ہیں اور ان کی تاریخ اور تفسیر سنیوں کی معتمد علیہ تاریخ اور تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ ان کی ولادت تیسری صدی ہجری میں اور وفات چوتھی صدی میں ہوئی۔ انہوں نے (رسول اللہ اور صحابہ رض کے زمانے کے اتنا عرصہ بعد) اپنی تاریخ مرتب کی تو کسی تحریری مواد سے نہیں، بلکہ زبانی روایات کی بنیاد پر ـــــ یعنی اس طرح کہ میں نے فلاں سے سنا اور اس نے فلاں سے سنا ـــــ اور اس طرح راویوں کا سلسلہ اوپر تک پہنچا دیا۔ اب تاریخ دان حضرات تو ایک طرف رہے، اہل علم بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ (رسول اللہ اور صحابہ رض) کے زمانے کے دو تین سو سال بعد، اس انداز سے مرتب کردہ تاریخ کی علمی حیثیت کیا قرار پا سکتی ہے؟ (حدیث کی صحیح ترین کتاب ـــــ بخاری ـــــ بھی اسی طرح مرتب ہوئی تھی) اس تاریخ میں ایسے ایسے واقعات درج ہیں جن سے (اور تو اور) خود حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس و اعظم کی سیرت طیبہ بھی (معاذ اللہ) داغدار ہو جاتی ہے۔ اور صحابہ کبارؓ کی زندگیوں کا تو ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے جس سے انسان کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ ان جلیل القدر ہستیوں کے خلاف، دشمنانِ اسلام

جس قدر حملے کرتے ہیں ان کی بنیاد انہی تاریخی روایات پر ہوتی ہے[1]۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا مذہبی طبقہ اس کتاب (اور اس سے ماخوذ دیگر کتب تاریخ) کو سینے سے لگائے لگائے پھرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص ان پر تنقید کی جرأت کرے تو اسے ملحد، بے دین قرار دے دیتا ہے۔

ان کتابوں پر تنقید کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ جن راویوں کا ان میں ذکر ملتا ہے، ان کے حالات کی تحقیق کی جائے اور دیکھا جائے کہ تاریخی اعتبار سے وہ اپنے بیانات کے راوی ہو بھی سکتے تھے۔ اور اگر ہو سکتے تھے تو وہ قابلِ اعتماد بھی تھے؟ اس طرح کی تحقیق "اسماء الرجال" سے متعلق کہلاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں، اس فن کے سب سے زیادہ ماہر علامہ تمنا عمادی مدظلہٗ ہیں۔ انہوں نے بڑی کاوش و عرق ریزی سے اس باب میں تحقیق کی ہے اور ان کے مضامین، طلوعِ اسلام میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے ہیں۔ اب وہ بہت ضعیف العمر ہو چکے ہیں (ان کی عمر اس وقت (۸۰) سال سے زائد ہے) اور ضعفِ بصارت کا یہ عالم کہ آتی گلاس کی مدد کے بغیر نوشت و خواند بھی مشکل ہے۔ اس سال وہ حج بیت اللہ کی تیاری کر رہے ہیں۔ (اللہ انہیں خیریت سے .... لے جائے اور خیریت سے واپس لائے) لیکن جاتے جاتے انہوں نے یہ مضمون ان تمام موانعات کے باوجود، ارتجالاً تحریر فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ میرا آخری مضمون ہوگا"! (خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ اللہ انہیں عمرِ دراز عطا فرمائے) اس مقالہ میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ امام ابن جریر طبری، اپنی کتاب میں جن اہم راویوں سے روایت کرتے ہیں۔ (یعنی وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات فلاں فلاں سے سُنی۔) ان کی وفات، امام طبری کی پیدائش سے بھی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس لئے ان کا یہ بیان کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ان روایات کو ان راویوں سے سُنا تھا۔ اور جب ان کے بنیادی راویوں کا یہ عالم ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد؟ —— اس سے ہماری تاریخ کی اس اولین اور معتبر ترین کتاب کے قابلِ اعتماد ہونے کی حقیقت سامنے آسکتی ہے۔

جہاں تک عہدِ محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ کرام رض کا تعلق ہے، ہمارا مسلک یہ ہے کہ اگر ہماری تاریخ میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جس سے ان عظیم ہستیوں کی سیرت پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہے، تو ہم بلا تامل و توقف کہہ دیں گے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ کی ذاتِ گرامی پر ایمان لانے سے ہم مسلمان ہوتے ہیں، اور صحابہ کبار رض کے "مومن حقاً" ہونے کی شہادت خود قرآن دیتا ہے جس پر ہمارا ایمان

---

[1] مودودی صاحب نے "خلافت و ملوکیت" کے نام سے جو رسوائے عالم کتاب شائع کی ہے اور جس میں اولوالعزم صحابہ کبار رض کے خلاف (معاذ اللہ) کثیف ترین کیچڑ اچھالا گیا ہے، اس کی بنیاد بھی اسی قسم کی کتب تاریخ ہیں۔

ہے۔ لہٰذا، اگر ایک طرف قرآن کی شہادت ہو اور دوسری طرف تاریخ کا کوئی ایسا بیان جو اس شہادت کے خلاف جاتا ہو، تو ہم قرآن کی شہادت کو ترجیح دیں گے اور تاریخی بیان کو بلا توقف مسترد کر دیں گے۔ یہی وہ راہِ صواب ہے جس کی طرف ہم شروع سے دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں، اور کبھی منکرِ حدیث قرار پاتے ہیں اور کبھی منکرِ شانِ رسالت ۔"

(۰)

للہ الحمد کہ علامہ صاحب، ادائیگیٔ فریضۂ حج کے بعد، بخیریت مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے اپنے اس مقالہ کی، جسے انہوں نے جاتے جاتے ارتجالاً تحریر فرمایا تھا، تکمیل کر دی۔ یہ مقالہ مبسوط ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں بڑا وقیع اور قابلِ اعتماد۔ اسے طلوعِ اسلام میں بالاقساط شائع کیا جائے گا۔ اس قسم کی تنقیدات سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہماری تاریخ کی صحیح حیثیت متعین ہو جائے اور ہم نے جو (محض تقلید اور غلو کی بنا پر) اسے دین میں سند اور حجت کا مقام دے رکھا ہے، اس غلط فہمی کو رفع کر دیا جائے۔ یاد رکھئیے۔ دین میں سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہے، اور وہی غلط اور صحیح کے پرکھنے کا قابلِ اعتماد معیار۔ تاریخ کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ لوگوں کی انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے جس میں غلط اور صحیح ہر قسم کی باتیں درج ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد آپ علامہ تمنا عمادی کے مقالہ کی قسطِ اول ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوعِ اسلام)

(۰)

مجھ کو اس کا اعتراف ہے کہ علامہ ابن جریر طبری بہت بڑے علامۂ دہر، بہت بڑے محدث، بہت بڑے مفسر، بہت بڑے مورخ اور بے مثل ادیب تھے۔ مگر وہ عجمی تھے اس لئے عجمی تعصب سے خالی نہ تھے۔ بلکہ اُن کے دل میں ناقلینِ عجم صحابہ کرامؓ سے کچھ کینہ بھی تھا۔ منافقینِ عجم نے جو اپنا بغض نکالنے کے لئے باہم متخالف و متضاد من گھڑت روایات کے ذریعے قرآنی احکام کو غتر بود اور مشتبہ کر دینے کی، مسلمانوں کو روایات میں اُلجھا کر قرآن مجید سے دور تر کر دینے کی، اور تاریخ اسلام کو بالکل مسخ کر دینے کی کوشش کی تھی، ان کی ناشکور کوششوں کو کامیاب بنانے والوں میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے یہی ابن جریر طبری تھے۔ تفسیر اور ضخیم ترین تفسیر لکھی تو ہر آیت کی تفسیر میں مختلف اور کہیں کہیں متضاد روائتیں اُنھیں منافقینِ عجم کی گھڑی ہوئی یا خود گھڑ کر درج کیں کہ ایک خالی الذہن انسان فیصلہ نہ کر سکے کہ آخر کون سی تفسیر اس آیت کی صحیح ہے۔

تاریخ میں ایسی ایسی روائتیں اُنھیں منافقین کی بھریں یا خود گھڑیں اور ایسے ایسے واقعات خلافِ واقعہ بنا بنا کر لکھے کہ وہ صحابہؓ سابقون الاولون جن کو رضوانِ الٰہی کی بشارت دی گئی بلکہ جن کے اتباع بالاحسان پر دوسروں کے لئے رضائے الٰہی موقوف ہے، جن کو اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا۔ فرمایا گیا، جن کے ایمان کو ایسا معیاری ایمان قرار

دیا گیا کہ دوسرے لوگ اُنھیں جیسا ایمان لائیں گے جبھی ہدایت پائیں گے جن کے جانی و مالی جہاد کی بدولت اسلام دنیا میں پھیلا۔ ایسے اساطین اسلام کے اخلاق حسنہ کے پاک و صاف دامن کو خود غرضی، نفس پرستی، اتباعِ ہوا، جاہ طلبی، اقتدار پسندی، بے انصافی اور مکاری و عیاری جیسے صفات رذیلہ و خبیثہ کے غبار سے انہیں خبیث روایتوں کے ذریعے آلودہ دکھایا تاکہ تاریخ اسلام پڑھنے والے ان اصحاب رسولؐ کو جن کے بارے میں قرآن مجید شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا ہے (بلکہ نگینے کی طرح) تمہارے دلوں میں ایمان کو مزین کر دیا ہے اور کفر سے، بدکاری سے اور نافرمانی سے تمہیں نفرت دلا دی ہے (حجرات) ان بزرگواروں کو آج ہی کل جیسے سیاستدانوں کی جماعت سمجھنے لگیں۔ یہاں تک کہ امہات المومنینؓ جن کی شان میں آیت تطہیر اتری بلکہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق پر بھی چھپے چھپے حملے کئے۔ اس مختصر مضمون میں مثالیں دینے کی گنجائش نہیں ہے اس کے لئے ایک پوری کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ابوجعفر ابن جریر طبری کی تفسیر و تاریخ نے مجھ کو اس پر مجبور کیا کہ میں ان کے شیوخ کو ذرا دیکھوں اور اُن کی روایتوں کی تنقید کر کے ان کے صدق و کذب کا پتہ لگاؤں۔

اتنا تو میں پہلے سے جانتا تھا کہ ابن جریر شیعہ تھے اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان کے ہمعصر اور قریب العصر سارے محدثین ابن جریر کو شیعہ اور جھوٹی حدیثیں جھوٹی روایتیں گھڑنے والا سمجھتے تھے۔ مگر الحمدللہ کہ مجھ کو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے تعصب اور غلو سے محفوظ رکھا ہے۔ مجھ کو شیعوں سے دینی اختلاف ہے تعصب و عناد نہیں۔ ابو اسحٰق السبیعی، سلیمان بن مہران الاعمش، منصور بن المعتمر، زبید الیامی، فطر بن خلیفہ وغیرہم تو مشہور شیعے تھے۔ عوف اعرابی کو شیطان خبیث لکھنے پر بھی ائمہ رجال جانتے تھے کہ[1] ان کی حدیثیں بخاری و مسلم وغیرہ میں ہیں۔ صحاح کی اور غیر صحاح کی کون سی کتاب حدیث ہے جس میں شیعے راویوں کی ایک بڑی جماعت نہیں ہے۔ حدیث کی کوئی کتاب خالص اہل سنت کی کتاب نہیں ہے۔ ہر کتاب میں شیعوں کا حصہ رسدی بھی موجود ہے۔ ابن جریر کے شیعہ ہونے کی شہادت انہیں لوگوں نے پیش کر دی ہے جن کو ابن جریر کے شیعہ ہونے سے انکار ہے یعنی حافظ ذہبی متولد ۶۷۳ھ و متوفی ۷۴۸ھ میزان الاعتدال میں فیہ تشیعٌ لکھتے ہیں۔ ابن حجر لسان المیزان میں ذہبی کی عبارت نقل کرتے ہیں تو تشیعٌ کے بعد یسیرٌ کا لفظ بڑھا دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہلکے پھلکے شیعے ہیں، کٹر شیعے نہیں ہیں۔ ابن حجر خود لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ امام احمد بن علی السلیمانی (متولد ۲۷۱ھ و متوفی ۳۱۱ھ) نے صاف فرما دیا تھا کہ کان یضع للروافض، یعنی ابن جریر رافضیوں کی موافقت میں حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ ابن حجر کا پہلے تو اس پر خفیف سی برہمی دکھانا پھر کہنا کہ اگر میں قسم کھا کر کہوں کہ سلیمانی نے اس ابن جریر طبری مفسر و مؤرخ کے بارے میں ایسا نہیں کہا ہے بلکہ دوسرے ابن جریر طبری کے بارے میں کہا ہے تو میری قسم غلط نہ ہوگی۔ محض ان کی حمایت لے جا رہے اس لئے

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

کہ دوسرا ابن جریر اول تو کوئی تھا ہی نہیں۔ اور اگر واقعی ہوتا تو اس کو تو خود شیعہ ہونے کا اقرار تھا۔ اس کو شیعے بھی شیعہ مانتے ہیں اور ابن حجر اور ذہبی بھی۔ جو خود شیعہ ہونے کا اعلان کرتا ہے جس کو سب شیعہ جانتے ہیں وہ اگر شیعوں کے مطابق حدیثیں گھڑے گا تو کہا جائے گا کہ یہ اپنے مذہب کے مطابق حدیثیں گھڑتا ہے۔ جو اپنے کو سنی ثابت کرتا ہو اور عام لوگ اس کو سنی سمجھتے ہوں وہ اگر شیعوں کے مطابق حدیثیں گھڑے گا جب کہیں گے کہ یہ شیعوں کے موافق حدیثیں گھڑتا ہے۔ امام سلیمانی ایسے نہ تھے کہ بغیر تحقیق اور قطعی ثبوت کے ایک مشہور معتبر مورخ کے بارے میں ایسا کہہ دیتے۔ ابن جریر کی وفات کے صرف گیارہ برس بعد امام سلیمانی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد نے ابن جریر کا زمانہ ضرور پایا تھا۔ امام سلیمانی کے نانا احمد بن سلیمان الکندی بہت بڑے محدث تھے جن سے یہ روایت بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے ابن جریر کو دیکھا ہوگا۔ اُن سے ابن جریر کے حالات معلوم ہوئے ہوں گے۔ اور کتنے ہمعصر ابن جریر محدثین سے بلکہ تلامذۂ ابن جریر سے خود سلیمانی ملے ہونگے۔ ابن جریر کوفے میں بیس سال سے زیادہ رہے تھے سلیمانی کوفے کے محدثین سے بہت روایت کرتے ہیں۔ ان کو کوئی محدثین سے بھی ابن جریر کے حالات معلوم ہوئے ہونگے۔

لہ (حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابن جریر شہر امل کے قدیم رہنے والے تھے۔ یہیں پیدا ہوئے یہیں پرورش پائی اور یہیں سے تحصیل علم کے لئے باہر نکلے۔ تحصیل علم سے فارغ ہوکر ۲۹۰ھ میں ۴۰ برس کی عمر میں جب وطن واپس ہوئے تو شہر امل میں رہنا پسند نہ کیا اس لئے کہ شہر امل خاص شیعوں کا گڑھ تھا۔ وہاں شیعے ہی شیعے بھرے تھے اور یہ جو بغداد و بصرہ و مصر و کوفہ میں ۴۰ برس تک تحصیل علم میں سرگرداں رہے تو از روئے تقیہ سُنی ہی بنے رہے اور سُنی ہی بن کر رہنے میں یہ شہرت عامہ حاصل کر سکتے تھے اس لئے اصل مرکز طبرستان میں آ گئے۔ انکے دادا کا اصل نام رستم تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد یزید نام رکھا گیا۔ ابن جریر خالص شیعوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن رستم لکھتے تھے اور سارے مسلمانوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن یزید لکھتے تھے۔ کئی صدیوں کے بعد لوگوں نے دو ابن جریر بنا ڈالے۔ ایک کو کٹر شیعہ قرار دیا، دوسرے کو بلکا پھلکا شیعہ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کسی مفتری نے ابن جریر بن رستم کے نام سے خالص شیعہ مذہب کی کتابیں تصنیف کر کے منسوب کر دیں اور متعدد کتابیں ابن جریر کے نام سے اور متعدد واقعات منسوب کئے گئے۔ دروغ گو را حافظہ نباشد کی بنا پر زمانے کا فرق محسوس نہ کیا تو عبداللہ المامقانی شیعہ امام فن رجال نے اپنی کتاب تنقیح المقال میں تین محمد بن جریر طبری قرار دیئے۔ اس کا مفصل ذکر میرے مقالے مطبوعہ طلوع اسلام ہفتہ وار ۱۹۵۵ء میں باقساط موجود ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ۔

طلوع اسلام۔ امام ابن جریر کو شیعہ ثابت کرنے سے مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ایک طرف سُنی حضرات کا عقیدہ ہے کہ جس روایت کا راوی شیعہ ہو وہ قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اور دوسری طرف ان کی کیفیت یہ ہے کہ جس تاریخ اور تفسیر کو وہ اپنے ہاں سب سے زیادہ قابل اعتماد سمجھتے اور مستند قرار دیتے ہیں اسکے مصنف خود شیعہ ہیں۔ لیکن شیعہ حضرات انہیں شیعہ تسلیم نہیں کرتے۔

ابن جریر کے حقیقی بھانجے ابوبکر محمد بن عباس الخوارزمی سے ملے ہوں گے جن کی وفات ۳۸۳ھ میں ۷۰ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ خوارزمی کی وفات کے وقت سلیمانی ۱۶ برس کے تھے پھر ابن جریر کی تفسیر اور تاریخ بھی ضرور پڑھی ہوگی۔ غرض امام سلیمانی نے ابن جریر کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ سمجھ بوجھ کر علیٰ وجہ البصیرت قائم کی تھی بسمعانی اپنی کتاب الانساب ورق ۵۰۳ کے صفحہ اول پر ان کا ترجمہ لکھتے ہیں، اس میں لکھا ہے "لم یکن لہ نظیر فی زمانہ اسناداً وحفظاً ودرایتہ بالحدیث وضبطاً وایقاناً" یعنی یہ اپنے وقت میں ایک بے نظیر محدث تھے ہر حیثیت سے اس لئے ممکن نہیں ہے کہ اتنے بڑے مفسر و مورخ پر اتنا بڑا الزام محض اٹکل پچو لگا دیں اور قیامت کی باز پرس سے مطلق نہ ڈریں۔

اور سب سے بڑی شہادت ابن جریر کے شیعہ ہونے کی تو خود ان کے بھانجے خوارزمی مذکور نے دے دی ہے یاقوت حموی معجم الادباء میں ابن جریر کا مفصل ترجمہ لکھتے ہیں، اس میں ابن جریر پر تشیع کے الزام کا ذکر کرتے ہوئے ابن جریر کے بھانجے خوارزمی مذکور کے دو شعر نقل کرتے ہیں۔

بآمل مولدی، وبنو جریر	فاخوالی، ویحکی المرء خاله
آمل میں میری پیدائش ہے اور جریر کے بیٹے	میرے ماموں ہیں اور ہر شخص اپنے ماموں کے مشابہ ہوتا ہے
فہا انا رافضیٌ عن تراث	وغیری رافضیٌ عن کلالہ
تو سن لو کہ میں وراثتہً رافضی ہوں	اور میرے سوا جو رافضی ہے وہ دور کے لگاؤ سے

فبای حدیث بعدہ یومنون؟ خاص ابن جریر کے گھر کی اس شہادت کے بعد بھی جو ابن جریر کو شیعہ نہ مانے اس سے بڑھ کر کون ہٹ دھرم اور ضدی ہو سکتا ہے۔ مگر یاقوت حموی بھی ابن حجر ذہبی اور خطیب بغدادی کی طرح ابن جریر کے عاشقوں میں تھے۔ وہ اتنی یقینی الصحت شہادت کو خود پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ خوارزمی جھوٹا ہے، ابن جریر ہرگز شیعہ نہ تھے۔

اور امام سلیمانی نے جو ابن جریر پر شیعوں کی حمایت میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا الزام عاید کیا ہے اس کی شہادت ان کی ہر تصنیف دے رہی ہے۔ تفسیر کو دیکھئے تو سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ امام سلیمانی کی تصدیق کر رہی ہے۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت ۵۵ کو دیکھئے تو ابن جریر کی دروغ بافیوں کی شہادت دے رہی ہے اور اس کے علاوہ بھی بعض مقامات امام سلیمانی کے الزام کی صحت پر دلالت کر رہے ہیں۔

ایک اور زبردست شہادت علامہ عبداللہ المامقانی ایرانی شیعہ مذہب کے بہت بڑے محدث اور فن رجال کے امام اپنی کتاب تنقیح المقال میں (مطبوعہ ایران) شیعہ مذہب کی مشہور کتاب "روضات الجنات" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مصنف نے ابن جریر مفسر و مورخ کو

شیعہ ہی تسلیم کیا ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ لکھی ہے کہ یہ ایسے شہر کے رہنے والے تھے جو شیعوں کا خاص مسکن تھا۔ خصوصاً آل بُویہ کی حکومت کے زمانے میں (کہ اس وقت وہاں کوئی سُنّی رہ نہیں سکتا تھا) ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اہلسنت کے چاروں مذاہب میں سے کسی مذہب کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔ تیسری دلیل یہ کہ حدیث غدیر خم کا اثبات کیا ہے۔ ولا یفعلہ الا شیعہ اور یہ شیعہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ یہ تو ایک شیعہ مصنف کی شہادت ہے جس کو دوسرے شیعہ مصنف نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے مگر روضات الجنات کے مصنف نے تین ہی باتیں لکھی ہیں۔ تین دلیلیں ان کے علاوہ مجھ سے بھی لے لیجئے۔ ۱۔ ابن جریر پاؤں پر مسح کو فرض سمجھتے تھے۔ ۲۔ ابن جریر طلاق کے مسئلے میں شیعہ مذہب کے مطابق فتوے دیا کرتے تھے۔ ۳۔ سب سے زبردست دلیل یہ ہے کہ ابن جریر نے مسئلہ امامت پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں امامت کو منصوص من اللہ ثابت کیا تھا۔ اس کتاب کا نام ابن جریر نے المسترشد رکھا تھا۔

طبرستان کے جس محلے[1] میں ابن جریر رہتے تھے اس محلے میں حنبلی مذہب کے متعدد علماء بھی رہتے تھے ان لوگوں نے ان کے شیعہ ہونے کا اعلان کیا اسی کتاب کے سبب سے جس کا ذکر ابن حجر وغیرہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ حنبلیوں نے ان پر ظلم کیا کہ ان کو شیعہ مشہور کر دیا۔ مگر حنفیوں نے شافعیوں نے اور مالکیوں نے اس مظلوم کی مطلق حمایت نہ کی بلکہ انہیں ظالموں کا ساتھ دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ سارے علمائے اہلسنت نے ابن جریر کا بائیکاٹ کیوں کیا؟

ابن جریر کی ولادت ۲۲۴ھ کی ہے۔ امام بخاری کی وفات کے وقت یعنی ۲۵۶ھ میں ابن جریر ۳۲ برس کے تھے۔ امام مسلم کی وفات کے وقت یعنی ۲۶۱ھ میں ابن جریر ۳۷ برس کے تھے۔ امام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی متوفی ۲۷۵ھ کی وفات کے وقت ۵۱ برس کے تھے۔ امام ابن ماجہ کی وفات کے وقت یعنی ۲۷۳ھ میں ۴۹ برس کے تھے اور امام ابو عیسٰے ترمذی متوفی ۲۷۹ھ کی وفات کے وقت ابن جریر ۵۵ برس کے تھے اور امام نسائی متوفی ۳۰۳ھ کی وفات کے وقت ۷۹ برس کے تھے۔ امام نسائی تو خراسانی تھے، ابوداؤد بھی سجستانی تھے، ابن جریر سے تعلقات اور حدیثوں کی لین دین کا بہت اچھا موقعہ تھا۔ مگر آخر کیا وجہ ہے کہ صحاح کی کسی کتاب میں ان کی ایک روایت بھی نہیں ہے، نہ ابن جریر ان میں سے کسی سے بھی روایت کرتے ہیں۔ صحاح سے باہر بھی

---

[1] طبرستان بہت بڑا شہر تھا۔ آمل اس کا ایک قصبہ تھا جہاں شیعے ہی آباد تھے۔ ابن جریر کا اصلی تولد و مسکن آمل ہی تھا مگر شیعوں میں رہ کر شہرت عام حاصل نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ اصل مرکز طبرستان میں' اپنے طویل سفر سے واپس آ کر بس گئے تھے مگر وہاں اہلسنت محدثین و علماء کی اکثریت تھی اسلئے ابن جریر کی دال وہاں نہ گل سکی اور ان کی مخالفتیں ہر طرف سے شروع ہو گئیں مگر یہ بھی دھن کے پکے تھے مرتے دم تک اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

اہل سنت جامعین حدیث کی کسی کتاب میں ان کی روایت سے کوئی حدیث نہیں ملتی۔ اگر عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی سمرقند میں تھے (متوفی ۲۵۵ھ) ان کی وفات کے وقت ابن جریر ۳۱ برس کے تھے اور بغداد و کوفہ و بصرہ و فسطاط و مصر کے دورے میں تھے سمرقند نہیں گئے تھے کہ امام دارمی سے کوئی حدیث لیتے یا ان کو کچھ دیتے، تو ابوالحسن الدارقطنی تو بہت متاخر ہیں ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریر کی وفات کے وقت چار برس کے تھے، ۳۸۵ھ میں وفات پائی۔ ان کی کتاب سنن دارقطنی میں تو ابن جریر کی کوئی روایت ان کے کسی شاگرد کے ذریعے پہنچی۔ یہاں تک، کہ ابوعبداللہ الحاکم صاحب مستدرک کو تو خود ابن حجر راقضی خبیث لسان المیزان میں لکھتے ہیں، دارقطنی کے تلامذہ میں سے تھے متوفی ۴۰۵ھ باوجود شیعہ ہونے کے ابن جریر کی کوئی روایت بھی ان کی کتاب میں کسی کے ذریعے نہیں پہنچ سکی۔ آخر سارے محدثین نے ان کا بائیکاٹ اور مکمل بائیکاٹ کیوں کر رکھا تھا؟ صرف حنبلیوں کا ظلم تو ان پر نہ تھا۔ اگر ظلم تھا تو سارے محدثین کا تھا۔ بلکہ یہ ایسے غالی سخت قسم کے شیعے تھے کہ اُس وقت کے ان کے ہمعصر شیعوں نے بھی ان کا بائیکاٹ کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے کہ ان کے سابقے وضاعوں کذابوں ہی سے زیادہ تھے۔ جہاں گئے جن جن کے جھوٹی حدیثیں گھڑنے والوں سے ملے، کذابوں سے ملے اور انہیں سے حدیثیں اور روایتیں لیں یا خود گھڑ گھڑ کے لکھیں۔ ان کو مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ سے تو کوئی دلچسپی تھی نہیں۔ خدا جانے حج بھی کیا تھا یا نہیں۔ نو برس کی عمر میں فراغت اور حفظِ قرآن کے بعد کتابتِ حدیث شروع کر دی۔ جیسا کہ یاقوت حموی معجم الادباء میں لکھتے ہیں جو مبالغے سے خالی نہیں ہے۔ حسب تصریح یاقوت حموی، طبری نے پہلے اپنے شہر کے محدثین سے حدیثیں لیں۔ کن کن حضرات سے حدیثیں لیں اس کا تو کریا قوت حموی نے نہیں کیا ہے۔ اپنے شہر کے محدثین سے فارغ ہوئے تو بقول ابن حجر بارہ[1] برس کی عمر میں گھر سے باہر نکلے اور رَے پہنچے۔ وہاں مشہور محدث محمد بن ادریس ابوحاتم الرازی[2] متوفی ۲۷۷ھ اُس وقت موجود تھے۔ مگر اُن کی طرف رجوع نہ کی۔ گئے تو کس کے پاس — محمد بن حمید الرازی کے پاس جن کو تہذیب التہذیب ص۹، ج۹، ۱۲۹ میں کثیر المناکیر وردی المذہب لکھا ہے اور لکھا ہے کہ دو شخصوں سے زیادہ کذب میں مہارت رکھنے والا میں نے نہیں دیکھا ہے۔ ایک تو سلیمان الشاذکونی دوسرے محمد بن حمید الرازی۔ اور بھی بہت کچھ ص۱۳۱ تک لکھا ہے۔ اور میزان الاعتدال میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے — کان کذابا لم یکن یحفظ القرآن — یہ کذاب تھا، اس کو قرآن حفظ نہ تھا۔ مگر ابن حجر لکھتے ہیں کہ کان یحفظ حدیثہ کلہ۔ یہ اپنی (گھڑی ہوئی) حدیثیں سب کی سب یاد رکھتا تھا۔ یعنی حافظے کی کمزوری نہ تھی۔ مگر قرآن مجید یاد رکھنے کی اس کو

---

[1] بارہ برس کی عمر میں انجان اور اجنبی جگہوں کا تنہا سفر وہ بھی مستقل سفر برسوں کا سفر قرنِ قیاس نہیں ہے۔ یقیناً بیس برس سے کم عمر میں وطن سے باہر نہ نکلے ہوں گے۔ واللہ اعلم۔ ۱۲

[2] متولد ۱۹۵ھ۔

کوئی ضرورت نہ تھی۔ اپنی من گھڑت حدیثیں روایت کرنے کے لئے ضرور یاد رکھتا تھا۔ غرض ابن جریر کو ایسے ہی استاد کی ضرورت تھی۔ گھر سے باہر نکلے اور رے پہنچے تو اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق اپنا ایک اُستاد ڈھونڈ نکالا۔

دوسرے صاحب جو وہاں ابن جریر کو ملے وہ حسب بیان یاقوت حموی مثنی بن ابراہیم الابلی تھے۔ یہ ایسے گمنام مفقود الخبر شخص ہیں جن کا ذکر نہ تذکرۃ الحفاظ میں ہے نہ تہذیب التہذیب میں، نہ میزان الاعتدال میں، نہ لسان المیزان میں، نہ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال میں، نہ تاریخ صغیر میں۔ ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل میرے پاس نہیں ہے اور نہ تاریخ بغداد ہے نہ طبقات ابن سعد ہے۔ مگر مجھ کو یقین ہے کہ ان کتابوں میں بھی ان کا ذکر نہ ہوگا۔ سری بن یحییٰ التمیمی کا ذکر بھی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ مگر عطاردی کی توثیق کے طفیل میں تاریخ بغداد میں سری ابن یحییٰ کا ذکر بھی آگیا اور وہ زندگی بھر کس مپرسی میں رہے تو دو سو برس کے بعد بطفیل عطاردی خطیب بغدادی کی زبانِ قلم سے "شیخ جلیل" "ثقۃ" تو بن گئے۔ اور کچھ حدیثیں جو بغیر طلب کے تحفۃً یا رشوۃً ابن ابی حاتم کے پاس بھیج دی تھیں اس کے صلے میں کتاب الجرح والتعدیل میں ان کا مختصر سا ذکر آگیا۔ ابن ابی حاتم اسوقت جوان تھے اور سری ابن یحییٰ اس وقت اسّی برس کے بوڑھے تھے۔ ھناد بن سری مشہور محدث کے بھتیجے تھے۔ اُن کو ان پر ترس آگیا اپنی کتاب میں ان کا مختصر ذکر کر دیا اور ان کو صرف صدوق کا لقب مل گیا۔ ورنہ سری بن یحییٰ التمیمی بھی بالکل مفقود الخبر ہی رہتے۔ ایسے مواقع مثنیٰ بن ابراہیم الابلی کو بھی مل گئے ہوں اس کی امید نہیں، ابن جریر کے طفیل میں ان کا نام صرف لوگ جانتے ہیں۔ غرض حسب بیان یاقوت حموی ابن جریر رے میں کئی برس رہ کر اپنے ان دونوں استادوں سے علم حاصل کرتے رہے اور حدیثیں گھڑنے کا فن سیکھتے رہے، پھر قریب ہی کے ایک گاؤں میں پہنچے جس کا نام حموی نے نہیں لکھا ہے۔ وہاں حسنِ اتفاق سے احمد بن حماد الدولابی سے ملاقات ہوگئی تو اُن سے بھی مزاج مل گیا۔ ان سے حدیثیں بھی لیں اور ان کے پاس سلمہ بن الفضل الابرش انصاریوں کے آزاد کردہ غلام رے کے مقیم متوفے ۱۹۱ھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ابن اسحٰق کی کتاب المبتداء والمغازی دیکھنے میں آئی تو اُن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ابن اسحٰق خود مائل بہ تشیع تھے۔ متعدد محدثین نے ان کو کذاب کہا ہے۔ امام مالک نے تو ان کو دجالوں میں سے ایک دجال فرمایا تھا وہ ان کی تاریخ ہی کی بنا پر فرمایا تھا۔ اس کو بھی سلمہ بن الفضل نے نقل کیا جو خود غالی شیعہ ضعیف الحدیث لا یحتج بہ اور مُتّہم بکذب تھا وہ کتاب بھی احمد بن حماد الدولابی کے پاس ان کو نظر آئی جو اُن کے ہم مزاج اور ہم مسلک تھے۔ ان کے پاس مقیم رہ کر ان سے پوری کتاب پڑھی پھر پوری کتاب کی نقل لی۔ اور بقول یاقوت حموی "وعلیہ بنیٰ تاریخہ" ۔ یعنی ابن اسحٰق کی اسی کتاب پر اپنی کتاب تاریخ کی بنیاد رکھی۔ یعنی بنیاد ہی صرف ابن اسحٰق کی کتاب المبتداء والمغازی پر رکھی گئی وہ بھی ایسی کتاب پر جس کے مصنف کو بقول

نے کذاب اور امام مالک نے دجّال کہا تھا جس کو ایک کذاب شیعے نے نقل کیا تھا مگر اینٹیں اور مسالے کہاں کہاں سے لائے گئے اس کو بھی سُن لیجئے۔ ایک مشہور کذاب جو حدیثیں گھڑا کرتا تھا علی بن مجاہد اس نے بھی ایک کتاب المغازی لکھی تھی۔ یہ بھی کندیوں اور عبدیوں کا آزاد کردہ غلام تھا۔ تہذیب التہذیب جلد ۷ صفحہ ۲۷۷ و صفحہ ۲۷۸ میں اس کا ترجمہ ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں۔ وکان یضع الحدیث وکان صنف کتاب المغازی فکان یضع لکل اسنادًا۔ یہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا اور کتاب المغازی تصنیف کی تھی۔ ہر بیان کے لئے اسناد گھڑتا تھا۔ ۱۸۲ھ یا اس سے دو ایک سال بعد مرا۔ اس کی کتاب بھی ابن جریر نے حاصل کر لی، پھر واقدی، کلبی، ہشام بن کلبی، ابو مخنف، سُدّی، کوفے کے شہرۂ آفاق رافضیوں کذابوں اور جھوٹی حدیثیں اور تاریخی روایتیں گھڑنے والوں کے ذخیرے بھی حاصل کئے کتب الیّ السری عن شعیب عن سیف بن عمر جو برابر ابن جریر لکھتے ہیں یہ سیف بن عمر کیسے ہیں اس کو بھی سن لیجئے۔ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۲۹۵ سے ۲۹۶ تک ان کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ ابن حجر اور حافظ ذہبی دونوں ان کو واقدی کے مثل گویا واقدی ثانی لکھتے ہیں ضعیف الحدیث، متروک الحدیث، منکر الحدیث، راوی موضوعات اور خود جھوٹی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والا، زندیق یعنی ملحد بے دین لکھا ہے۔ جو شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر منسوب کر سکتا ہے وہ کیا جھوٹے تاریخی واقعے نہیں گھڑ سکتا ہے؟ ایسے بے دین کذاب کے بیان کردہ تاریخی واقعے کب قابلِ اعتبار ہو سکتے ہیں؟ انھیں کذابوں اور ملحدوں کی روایتوں کا ذخیرہ تاریخ ابن جریر طبری ہے۔ ع

قیاس کن زگلستان او بہارش را

بعض ثقہ راویوں سے بھی ابن جریر نے ضرور حدیثیں اور خبریں لی ہوں گی۔ اس سے کون انکار کرتا ہے مگر ان میں بھی کتنے ایسے ہیں کہ بغیر لقاء و سماع کے اُن کی طرف بعض روایتیں منسوب کر دی گئی ہیں شہاب الدین یاقوت حموی نے معجم الادباء میں (حسب تحریر بعض اہل علم اعزہ سلمہم اللہ) لکھا ہے کہ ابن جریر ے سے بصرہ پہنچے اور پھر ۲۵۳ھ میں فسطاط اور ۲۵۶ھ میں مصر پہنچے اور پھر بغداد گئے اور ۲۹۰ھ میں طبرستان اپنے وطن واپس گئے۔ میرے پاس معجم الادباء نہیں ہے اور باوجود کوشش کے نہ مل سکی۔ نورچشم مولانا قاری شاہ جعفر صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ کے خط سے اسی قدر معلوم ہوا جو لکھا۔ ایک دوسرے عزیز کو ہندوستان بھی خط لکھا تھا۔ ان کے خط سے بھی اسی قدر پتہ لگا۔ مگر ان کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ ابن جریر ے سے پہلے مدینۃ الاسلام بغداد گئے۔ اور

لہ میرے پاس معجم الادباء نہیں ہے اور باوجود جستجو کے نہ ملی تو بعض اعزہ کو خط لکھا کہ اس کے فلاں فلاں مضامین نوٹ کر کے بھیج دیں۔ دو عزیزوں نے جو نوٹ بھیجے ہیں انہیں پر اعتماد کر کے لکھ رہا ہوں۔ ۱۲ تمنا عفی عنہ

بغداد سے بصرہ آئے اور ہر جگہ موجود الوقت محدثین سے حدیثیں لیں جیسے محمد بن موسیٰ الحرشی محمد بن المعلٰی[1]، حماد بن موسیٰ القزاز، بشر بن معاذ اور ابو الاشعث وغیرہم۔ اور محمد بن بشار بن یزید القزاز البصری سے بھی حدیثیں لیں۔ پھر کوفے کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا۔ ابو کریب محمد بن العلاء الہمدانی، ہناد بن السری وغیرہم سے حدیثیں لیں۔ ابن جریر نے خود یہ بھی کہا تھا کہ میں نے مسند یعقوب بن ابراہیم الدورقی بھی لکھ ڈالی تھی۔ مگر اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد ابن جریر مصر کی طرف گئے، فسطاط ہوتے ہوئے۔ یہاں ابو الحسن بن السراج الطغری[2] اس وقت موجود تھے اور ابو ابراہیم اسمٰعیل بن ابراہیم المزنی متوفی ۲۶۴ھ بھی موجود تھے۔ ان سے ان کی کتاب الشافعی لے کر نقل کی جس کو وہ حسن بن محمد بن الصباح الزعفرانی سے اور وہ امام شافعی سے روایت کرتے تھے۔ اور ابن جریر نے اس کتاب کو ایک جماعت کے سامنے عراق میں پڑھا۔ ابن جریر ۲۵۶ھ میں مصر پہنچے تھے اور فسطاط کی طرف اس سے تین برس پہلے ۲۵۳ھ میں گئے تھے۔ دوبارہ طبرستان ۲۹۰ھ میں واپس گئے۔ (اتنی تفصیل ہندوستان کے خط سے معلوم ہوئی)

ہندوستان والے اس خط میں بالتصریح حالات زیادہ ہیں۔ مگر دونوں خطوط سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ ابن جریر ۲۵۳ھ میں یعنی ۲۹ برس کی عمر میں فسطاط پہنچے تھے اور ۳۲ برس کی عمر میں مصر۔ وہ کوفے کس سنہ میں پہنچے تھے اس کا پتہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ مولانا قاری شاہ جعفر سلمہٗ اللہ تعالیٰ کے خط میں کوفے کا ذکر نہیں ہے۔ ہندوستان کے خط میں جو کچھ ہے اس سے صاف پتہ ملتا ہے کہ ابن جریر بصرہ فسطاط اور مصر سے فارغ ہو کر کوفے پہنچے تھے۔ مصر سے امام شافعی کی کتاب لے کر عراق یعنی کوفے پہنچے تھے اور وہاں لوگوں کو پڑھ کر سنائی تھی۔ اس لئے ۲۵۶ھ کے کئی برس بعد وہ کوفے پہنچے تھے۔ کیونکہ ۲۵۶ھ میں تو وہ مصر پہنچے ہی تھے۔ مصر کے محدثین سے ملنے میں، ان سے حدیثیں لینے میں، امام شافعی والی پوری کتاب کے نقل کرنے میں یقیناً کافی وقت صرف ہوا ہوگا۔ قرینہ غالب ہے کہ وہ ۲۶۰ھ یا اس سے کچھ قبل یا بعد کوفے پہنچے تھے۔ اس کے بعد تیس برس کی طویل مدت انھوں نے کوفے میں گزار کر اور یہاں سے واقدی و ابو مخنف و کلبی و سدی و ہشام بن کلبی اور سیف بن عمر کی من گھڑت تاریخی روایتوں کے ذخیرے نقل کر کر کے جمع کر لئے تو ۲۹۰ھ میں اپنے وطن طبرستان پہنچے، اور وہاں پہنچ کر تفسیر بھی لکھنے لگے اور تاریخ بھی مدون کرنے لگے۔ مگر اس کے لئے پھر کم سے کم تیس برس کی اور ضرورت تھی۔ مگر موت نے بیس برس سے زیادہ مہلت نہ دی اور ۳۱۰ھ میں ۸۶ برس کی

---

[1] خط میں یہ نام اسی طرح پڑھا گیا۔ غالباً صحیح محمد بن مثنیٰ ہے۔ ۱۲

[2] خط میں جس طرح لکھا ہے میں نے نقل کر دیا مگر یہ لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تمنا عفرلہٗ

عمر پاکر وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہاں ان کے ساتھ کچھ تلامذہ بھی ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے ان کے ناتمام کام کو مکمل کر کے تفسیر ابن جریر و تاریخ ابن جریر کو ان کے منشاء کے مطابق مرتب و مدون کر ڈالا۔ اس لئے تاریخ میں خصوصاً قال ابوجعفر اور بعض جگہ قال ابوجعفر رحمۃ اللہ اور ص۱۳۶ جلد چہارم تاریخ میں ہے قال ابوجعفر الطبری رحمۃ اللہ ـــ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کم سے کم تاریخ کو حضرات کے بعد انکے شاگردوں نے مرتب و مدون کیا۔ وہ کون لوگ تھے؟ کس تماش کے تھے؟ عالم الغیب ہی اس کو جانتا ہے۔

افشائے راز

اللہ تعالےٰ بھلا کرے یاقوت حموی کا کہ انھوں نے اپنی کتاب معجم الادباء میں ابن جریر طبری کا مفصل حال لکھ کر اس راز کو فاش کر دیا کہ ۲۵۶ھ سے پہلے جو بصری محدثین وفات پا چکے تھے اور ۲۶۰ھ سے پہلے جو کوفی محدثین وفات یاب ہو چکے تھے ان سے ابن جریر کی روایتیں متصل نہیں ہو سکتی ہیں۔ ہناد بن السری، ابوہمام ولید بن شجاع دونوں کی وفات ۲۴۳ھ میں ہے۔ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے ۱۷ برس پہلے جب ابن جریر صرف ۱۹ برس کے تھے شاید اس وقت اپنے وطن سے باہر نکلے بھی نہ ہونگے اور بقول ابن حجر باہر نکلے بھی ہوں گے تو محمد بن حمید الرازی سے رے میں حدیثیں گھڑنے کا فن سیکھ رہے ہوں گے۔ اس وقت تو وہ احمد بن حماد الدولابی سے بھی نہ ملے ہوں گے۔ اسی طرح بُوَین یعنی محمد بن سلیمان بن حبیب ابو عبداللہ المصری الکوفی متوفی ۲۴۵ھ، ابوالحسن علی بن محمد بن اسحاق الطنافسی الکوفی، سفیان بن وکیع الکوفی متوفی ۲۴۷ھ وغیرہم ابن جریر کے بہت سے کوفی شیوخ ایسے ملیں گے جو ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے اور ان سے ابن جریر نے ایک لفظ بھی نہیں سنا بلکہ ان کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح ان کے بصری شیوخ، ان کے مصری شیوخ اور ان کے بغدادی شیوخ بھی ایسے کتنے ہوں گے جو ان کے پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے ہوں گے۔ ابن جریر نے ان کی صورت تک دیکھی نہ ہوگی مگر ابن جریر ان کے تلامذہ سے کچھ حدیثیں لیکر تلامذہ کے نام اڑا کر بلاواسطہ ان سے روایت کرنے لگے اور بعض باتیں حسب ضرورت گھڑ کر ان سے روایت کرنے لگے۔

(باقی آئندہ)

جہانِ نو

مطبوعات ادارہ طلوع اسلام کی تفصیلی فہرست جس میں ہر ایک کتاب کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے کہ اس سے اسکا پورا آئینہ سامنے آجاتا ہے۔ ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیں! ناظم

حقائق و عبر

۱۔ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات!

اس رپورٹ کو ذرا غور سے پڑھیئے :-

"عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھے جشنِ غالب کی بین الاقوامی تنظیمی کمیٹی کا معتمد[1] مقرر کیا تھا۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے یہ اعزاز بخوشی منظور کیا اور جشنِ غالب کی کمیٹیوں کی تنظیم کی غرض سے مندرجہ ذیل ممالک کا سفر کیا۔

(۱) انگلستان۔ (۲) امریکہ۔ (۳) کناڈا۔ (۴) فرانس۔ (۵) اٹلی۔ (۶) نیدرلینڈ۔ (۷) چیکوسلواکیہ۔ (۸) سوویٹ یونین۔ (۹) ایران۔

انگلستان :- انگلستان میں میں نے جن عالموں سے رابطہ قائم کیا اور جنہوں نے میرے ساتھ مکمل تعاون کا وعدہ فرمایا۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) ۱۔ پروفیسر سی فلپس ڈائریکٹر اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹیڈیز لندن۔ ۲۔ پروفیسر اے جے آربری کیمبرج یونیورسٹی۔ ۳۔ سو تنزر۔ ہے میکلین، ممبر پارلیمنٹ۔ ۴۔ پروفیسر پیسول اسپیر کیمبرج یونیورسٹی۔ ۵۔ مسٹر رالف رسل، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹیڈیز لندن۔ ۶۔ مسٹر کیبرنان۔ ایڈنبرا یونیورسٹی۔ ۷۔ مسٹر ایس سی سٹن۔ لائبریرین۔ انڈیا آفس لائبریری۔ ۸۔ مس جین ریڈ کلف۔ انڈیا آفس لائبریری۔ ۹۔ مسٹر سائمن ڈگبی۔ لندن یونیورسٹی

(ب) ان حضرات سے صلاح مشورے سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

(۱) انگلستان میں ایک قومی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس کے صدر پروفیسر سی فلپس اور سیکرٹری رالف رسل صاحب ہیں۔ (۲) غالب پر ایک سیمنار منعقد کیا جائے گا۔ (۳) غالب سے متعلق ایک نمائش ہوگی۔ (۴) غالب کی زندگی اور

---

[1] پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔

ان کے کارناموں سے متعلق ایک آپا پیش کیا جائے گا۔ ۵۔ غالب کی اردو تخلیقات کا انگریزی ترجمہ رالف رسل صاحب اور ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب نے مشترکہ طور پر کیا ہے جس کی اشاعت کا اہتمام یونسکو کر رہی ہے (۶) میں نے برٹش میوزیم۔ انڈیا آفس لائبریری۔ ویلسٹر پلیس لائبریری اور انگلستان کے نیشنل آرکائوز میں غالب کے ان تمام غیر مطبوعہ خطوط کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو لندن میں مقیم حکام کے نام لکھے گئے تھے۔ یہ تحقیق ابھی جاری ہے۔

امریکہ:- میں دہلی یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اگست ۱۹۶۷ء میں این آربر (مشی گن امریکہ) گیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے دنیا کے ممتاز مستشرقین اور علمائے اردو سے جشن صد سالہ غالب کے سلسلہ میں تبادلہ خیالات کیا۔

یہاں بھی ایک قومی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی جس کے صدر پروفیسر نارمن براؤن، سیکرٹری چوہدری محمد نعیم اور اراکین میں پروفیسر کینیٹ ول اسمتھ، پروفیسر عبدالرحمان بارکر، پروفیسر رابن سن اور پروفیسر داؤد رہبر شامل ہیں۔

امریکہ میں جشن غالب کے سلسلے میں مندرجہ ذیل پروگرام بنایا گیا ہے۔

(۱) غالب کی ایک ببلوگرافی مرتب کی جائے۔ (۲) غالب سے متعلق تنقیدی نگارشات کا ایک انتخاب مرتب کیا جائے۔ (۳) ۱۹۶۹ء (سال جشن) میں ہندوستان یا پاکستان کے کسی عالم کو اردو ادب پر کام کرنے کے لئے مدعو کیا جائے۔

کناڈا:- میں مونٹریل کے ادارہ علوم اسلامیہ میں گیا اور جشن غالب کے سلسلے میں ان حضرات کا تعاون حاصل کیا۔

(۱) پروفیسر عبدالرحمان بارکر صدر شعبہ علوم اسلامیہ میکگل یونیورسٹی۔ ۲۔ پروفیسر عزیز احمد، یونیورسٹی آف ٹورنٹو

فرانس:- (الف) پیرس میں میں نے جن حضرات سے رابطہ قائم کیا، ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) پروفیسر آندرے گم برے تیر، پروفیسر اردو اسکول آف اورینٹل لینگویجز، پیرس۔ ۲۔ کاؤنٹ ہنری ڈی لاباستید وطسٹ۔ پروفیسر آف مغرب سویلیزیشن اسکول آف اورینٹل لینگویجز۔ (۳) ڈاکٹر ایم لاکومب، ڈائریکٹر آف دی انسٹی ٹیوٹ آف انڈین سویلیزیشن۔ (۴) موسیو ایم بے لا، ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔

(ب) پروفیسر اندرے گم برے تیر غالب کی دس غزلوں کا ترجمہ فرانسیسی میں کر رہے ہیں۔ ان کا نام یونیسکو نے منظور کر لیا ہے۔

(ج) پروفیسر گم برے تیر جشن غالب کی فرانسیسی قومی کمیٹی کے سیکرٹری ہونگے۔

ڈاکٹر لاکومب پروفیسر جے فلیوزا اس کمیٹی کے صدر ہوں گے۔

یونیسکو:- یونیسکو پیرس میں مندرجہ ذیل حضرات سے بہت اہم گفتگو ہوئی۔

(۱) ڈاکٹر ظہیر حسین پارٹی سی پٹیشن پروگرام۔ ۲۔ مسٹر ایس رونہمال پبلسٹی پروگرام ڈائریکٹر آر کے لولئے۔ ۳۔ ڈاکٹر موڈشی نوف سنٹرل ایشین پروگرام۔ ۴۔ مسٹر ملھان اوشیانا ڈویژن۔ ۵۔ جناب معظم حسین ایجوکیشن۔

یونیسکو کے ارباب حل وعقد سے گفتگو کے دوران مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئیں۔ اگر یہ جانب نیشنل کمیشن کی جانب سے پیش کی جائیں تو یونیسکو ان پر ہمدردانہ غور کرے گی۔

(اس کے بعد ان تجاویز کی تفصیل دی گئی ہے۔ اور پھر تحریر ہے)

لی آن :۔ لی آن میں مندرجہ ذیل حضرات سے گفتگو ہوئی۔ جنہیں میرے اعزاز میں ایک لنچ پر خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا۔

۱۔ پروفیسر جین نے برڈاٹ ریکٹر آف اکیڈمی ایجوکیشن وڈین فیکلٹی آف لیٹرز یونیورسٹی لی آن۔

۲۔ پروفیسر ویریرس	پروفیسر انگریزی
۳۔ ڈاکٹر مانڈری	پروفیسر سنسکرت
۴۔ ڈاکٹر دیا ریر	پروفیسر چینی زبان
۵۔ ڈاکٹر اجین	پروفیسر فارسی
۶۔ ڈاکٹر ای سیف	پروفیسر مسلم تہذیب و تمدن
۷۔ ڈاکٹر اسے لیر	پروفیسر جاپانی زبان

۸۔ مسٹر سولا۔ ریکٹر کی کابینہ کے صدر

یہ طے پایا کہ یونیورسٹی آف لی آن میں صد سالہ جشن غالب کمیٹی زیر صدارت ڈاکٹر ہیلر ڈاٹ تشکیل کی جائے۔"

(بشکریہ۔ قومی زبان۔ کراچی)

اُردو کے متعلق یہ اس ملک میں ہو رہا ہے جو اردو کو دیس نکالا دینے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہا ہے اس کے بعد آپ اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھئے۔ یہاں اردو کی مستقل حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ملک میں متعدد ادارے ایسے موجود ہیں جنہیں اردو زبان کی تحقیق و ترویج کے سلسلہ میں (مجموعی طور پر) لاکھوں روپے سالانہ ملتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے "شہیدانِ اردو" مصروفِ جہاد ہیں۔ کبھی ان کی طرف سے بھی اس قسم کی کوئی رپورٹ دیکھنے سننے میں آئی ہے؟ یہاں بھی "جشنِ غالب" کی سوگواری آواز کبھی کبھار کانوں میں پڑتی ہے۔ کیا اس کے اربابِ حل و عقد نے بھی اس قسم کی کوئی جدوجہد کی ہے؟

پھر اس جدوجہد کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھئے۔ ہندوستان نے اس ایک اقدام سے دنیا میں اپنے حق میں کس قدر پراپیگنڈہ کر لیا ہے۔ کیا ہمارے ہاں کے اربابِ حل و عقد کو بھی ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کی

کبھی سوچا بھی ہے ؟

اس کے بعد آپ گردشِ ایام کا رُخ پیچھے کی طرف موڑیئے اور دیکھئے کہ تقسیم ہند سے پہلے انھی اردو کی احیاء اور ترقی کے لئے ہم کیا کچھ کیا کرتے تھے!

اور پھر سوچئے کہ پاکستان ملنے کے بعد ہمیں کیا ہو گیا ہے، اور کیوں ایسا ہو گیا ہے ؟

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی !

۴۔ قرعہ اندازی

ہفت روزہ المنبر (لائل پور) کی مرحون کی اشاعت کے اداریہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

وزیر دفاع نے قومی اسمبلی میں فرمایا ہے کہ حج کی درخواستوں کی قرعہ اندازی کے طریق کار میں ابھی تک کوئی سقم نہیں پایا گیا۔ تاہم اگر کوئی بہتر اور موزوں طریق کار سامنے آیا تو حکومت اس پر غور کرے گی۔

ہم نہایت ادب سے گزارش کریں گے کہ قرعہ اندازی میں کوئی سقم ہو یا نہ ہو، قرعہ اندازی فی نفسہٖ ناجائز ضرور ہے اور اسے بلا تاخیر یکسر ختم ہونا چاہیئے۔

خط کشیدہ الفاظ کو ذہن میں محفوظ رکھیئے اور پھر ایک گذری ہوئی بات سنیئے۔ کچھ عرصہ ہوا ہم نے ایک استفسار کے جواب میں لکھا کہ قرعہ اندازی (اور لاٹری) جوئے ہی کی ایک قسم ہے اس لئے اس سے اجتناب لازم ہے۔ اس پر ایک صاحب نے لکھا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ اپنی بیویوں رضہ کو قرعہ اندازی کے ذریعے سفر میں ساتھ لیجایا کرتے تھے پھر قرعہ اندازی ناجائز کیسے ہو سکتی ہے ؟ ہم نے کہا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ قرآنی تعلیم کے خلاف ہے اور حضورؐ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتے تھے جو قرآن کے خلاف ہو۔ اس پر ہمیں "منکرِ حدیث" قرار دے دیا گیا۔

اور اب یہ حضرات اُس حدیث کو بھی صحیح مان رہے ہیں اور قرعہ اندازی کو فی نفسہٖ ناجائز بھی قرار دے رہے ہیں، اور نہیں سوچتے کہ اس سے خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے!

دیکھیئے ۔ زمانے کے تقاضے ان حضرات کو وہی مسلک اختیار کرنے پر کس طرح مجبور کر رہے ہیں جس مسلک کو طلوع اسلام برسوں سے پیش کئے چلا آ رہا ہے۔ یعنی یہ مسلک کہ جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہو یا جس سے نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی شان میں کسی قسم کا طعن پایا جائے، وہ صحیح نہیں ہو سکتی خواہ وہ حدیث کی

کسی کتاب میں بھی کیوں نہ ہو۔

(۰)

۳۔ بیت المال

محترم وزیرِ خزانہ (مرکزی) نے ایوان میں اعلان فرمایا کہ:

سارے ملک میں یونین کونسلوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کی سطح پر بیت المال قائم کئے جائیں گے۔ (بحوالہ نوائے وقت ۲۱ ۷/۷)

"بیت المال" سے ان کا مقصود کیا ہے، اس کی تفصیل تو اخبارات میں نہیں آئی، لیکن مذہب کا جو تصور ان حضرات کے ذہن میں ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "بیت المال" سے ان کی مراد یہ ہے کہ زکوٰۃ، فطرانہ، صدقہ، خیرات کا روپیہ الگ اکٹھا کر کے اسے کونسلوں کی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ اسے "مذہبی امور" پر صرف کریں۔

ہم محترم وزیرِ خزانہ کی خدمت میں عرض کریں گے جسے آپ کی اصطلاح میں حکومت کا خزانہ یا (PUBLIC TREASURY) کہا جاتا ہے اسی کو عربی زبان (اور اسلامی حکومت کی اصطلاح میں) بیت المال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلامی حکومت کے خزانہ ہی کو بیت المال کہتے ہیں۔ اس حکومت میں دو الگ الگ خزانے نہیں ہوتے۔ یہ تصور کہ حکومت کا خزانہ الگ ہوتا ہے اور "بیت المال" الگ، اس دور کا پیدا کردہ ہے جب دین کو "مذہب" اور "دنیا" کے دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دین میں ثنویت (DUALISM) کا یہ یکسر غیر اسلامی تصور ابھی تک چلا آ رہا ہے اور یہی وہ اسلام ہے جسے مُلّا پیش کرتا ہے۔

ہم حکومت کی خدمت میں عرض کریں گے کہ مجوزہ "بیت المال" کے قیام سے آپ اسلام کی کوئی خدمت نہیں کریں گے بلکہ "خدا اور قیصر" کے اس غیر اسلامی تصور کو اور مستحکم کر دیں گے جس نے دین کو باقی ہی نہیں رہنے دیا۔ اگر حکومت یہاں قرآنی نظام کے قیام کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تو کم از کم اس قسم کے خلافِ اسلام تصورات کی جڑیں مضبوط کرنے سے تو اجتناب کرے!

(۰)

۴۔ بجا فرمایا آپ نے!

مودودی صاحب نے اپنی راولپنڈی کی تقریر میں فرمایا۔

اگر کوئی شخص یا گروہ یہ کہتا ہے کہ ملک کے باشندے اپنے ملک کا نظام چلانے کے

اہل نہیں ہیں، وہ کم فہم اور بے شعور ہیں. تو درحقیقت وہ شخص (یا گروہ) ایک بہت بڑا جھوٹ کہتا ہے اور ایک بہت بڑا دعوی کرتا ہے۔۔۔ جب وہ ملک کے تمام باشندوں کو بے شعور ٹھیراتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس جھوٹ سے بڑا کوئی دوسرا جھوٹ نہیں ہو سکتا. یہ ایک بہت بڑا دعوی اس لحاظ سے بن جاتا ہے کہ وہ شخص (یا گروہ) اپنے مقابلے میں پوری کی پوری قوم کو بے شعور فرض کر لیتا ہے. تو وہ شخص خود بھی جھوٹا ہے اور اس کا یہ دعوی بھی جھوٹا ہے کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ یہ دعوی نہیں کر سکتا.

(بحوالہ ایشیا۔ بابت ۵ جولائی ۷۰ء)

مودودی صاحب نے یہاں بہت اچھا اصول بیان فرمایا ہے کہ جو شخص پوری کی پوری قوم کو مردود قرار دیتا ہے وہ جھوٹا بھی ہے اور بدنیت بھی. اب دیکھئے کہ قوم کو اس طرح مردود کون قرار دیتا ہے؟ اس کے لئے ذیل کا بیان غور سے پڑھئے.

یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے (۹۹۹) فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں. نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے. باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لئے یہ مسلمان. نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا. ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگ دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے.

آپ کو معلوم ہے کہ قوم کے متعلق یہ ارشادات کس کے ہیں؟ خود مودودی صاحب کے جنہیں ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی محرم ۱۳۶۰ھ کی اشاعت سے نقل کیا گیا ہے. انہوں نے مسلمانوں کی قوم کو بے شعور ہی نہیں کہا اسے اسلام سے بے بہرہ اور دنیا بھر کے عیوب کا مجسمہ قرار دیا ہے.

اس کے بعد آپ فیصلہ کر لیجئے کہ یہ صاحب خود اپنے الفاظ میں کیا قرار پاتے ہیں!

---

۵. یہ بھی شریعت۔ وہ بھی شریعت

مودودی صاحب نے اپنی دستوری تجاویز میں لکھا تھا.

مجالس دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے. اسلام

کے اصول ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظامِ ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے اور یہ فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۶۴ء کے انتخابات کے سلسلہ میں، جماعت اسلامی نے محترمہ فاطمہ (مرحومہ) کو (مجلس دستور ساز کی رکنیت نہیں بلکہ) صدارت کے لئے کامیاب کرانے کے لئے سر توڑ کوشش کی۔

اگلے دنوں راولپنڈی کی ایک مجلس میں، ایک صاحب نے (جو غالباً جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے) مودودی صاحب سے یہ سوال کیا کہ

گذشتہ صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی جب متوقع ہی نہ تھی تو آپ نے ایک عورت کی حمایت کر کے کیوں بدنامی مول لی اور اپنا وقت کیوں ضائع کیا۔

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے جو باتیں ارشاد فرمائیں، وہ (اخبار ایشیا بابت ۲۸/۹ کے) بھرپور کالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ آخر میں انہوں نے فرمایا کہ

یہ ایک بہت بڑا تجربہ تھا جس سے ہم نے پورا فائدہ اٹھایا۔ نہ یہ وقت کا ضیاع تھا۔ اور نہ کوئی غیر شرعی فیصلہ تھا۔

یعنی پہلے شریعت کا یہ فیصلہ تھا کہ عورتیں مجلس دستور ساز کی رکن بھی نہیں ہو سکتیں۔ اور اس کے بعد اسی شریعت کا یہ فیصلہ ہو گیا کہ عورت ملک کی سربراہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ہے وہ میکیاولی شریعت جو ہر مصلحت کے ساتھ اپنا فیصلہ بدل لیتی ہے۔

لیکن ہمیں سب سے زیادہ تعجب اس جماعت سے متعلقین پر آتا ہے جو مودودی صاحب کی اس قسم کی باتوں سے بھی مطمئن ہو جاتے ہیں ——— کس قدر "خوش نصیب" (یا بدنصیب) ہے وہ لیڈر جسے اس قسم کے متبعین مل جائیں جن کا مسلک یہ ہو کہ

ہمیں تو خوش ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے!

۷۔ خالص دینی مقاصد

جب مودودی صاحب سے کہا جاتا ہے کہ آپ ایک مبلغ دین ہیں۔ اس لئے آپ دین کی تبلیغ کیا کریں۔ آپ سیاست میں کیوں حصہ لیتے ہیں۔ تو اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں دین اور سیاست الگ الگ چیزیں نہیں۔ جو شخص دین کی تبلیغ کے لئے اٹھے گا اُسے سیاست میں حصہ لینا ہوگا۔

۱۶ جون ۱۹۶۸ء کے ایشیا میں ایک مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حکومت دوسروں کو تو تبلیغ کے لئے باہر جانے کی اجازت (اور زرمبادلہ) دے دیتی ہے لیکن مودودی صاحب کو اجازت نہیں دیتی۔ حالانکہ

مودودی صاحب جب بھی کبھی بیرونِ ملک تشریف لے گئے ہیں خالص دینی مقاصد کے لئے گئے ہیں۔

کیا ہم معاصر موصوف سے پوچھ سکتے ہیں کہ یہ "خالص" دینی مقاصد کیا ہوتے ہیں؟ لامحالہ اس سے مفہوم یہی ہوگا کہ ان مقاصد میں کوئی سیاسی مقصد شامل نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ جب کسی مقصد میں سیاست شامل نہ ہو تو کیا (خود آپ حضرات کے دین کے تصور کی رُو سے) وہ مقصد "دینی" کہلا سکتا ہے؟ اور اگر سیاست خود دین کے اندر شامل ہوتی ہے تو خالص دینی مقاصد سے کیا مراد ہے؟

آگے چل کر لکھا ہے۔

ان تمام سفروں میں علاوہ خالص دینی مقاصد کے مولانا نے اپنے ملک کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ عرب ممالک پر مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان کے مبنی برحق موقف کی اطمینان بخش وضاحت تھی۔

سوال یہ ہے کہ کیا "اپنے ملک کی عظیم خدمت" دینی مقاصد میں شامل تھی یا نہیں۔ اگر یہ بھی دینی مقاصد میں شامل تھی تو پھر "خالص دینی مقاصد" کون سے تھے؟

معاصر موصوف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "اپنے ملک کی خدمت" سے الگ، مودودی صاحب کے جو مقاصد "خالص دینی" بتلائے جاتے ہیں، وہی بہی خواہانِ ملک کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں۔

۷۔ کیا تمام مذاہب سچے ہیں؟

۲۴ مئی ۱۹۶۸ء کے المنبر (لائل پور) میں مولانا وحید الدین خان صاحب کا ایک مقالہ عنوانِ بالا سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ نظریہ کہ تمام مذاہب سچے ہیں، کسقدر باطل اور گمراہ کن ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا ہے کہ ہندوستان میں اس نظریہ کو ہندو لیڈروں نے پھیلایا ـــــ مثلاً مہاتما گاندھی، ڈاکٹر رادھا کرشن، ڈاکٹر تاراچند۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ ـــــ انہوں نے اپنے مقالہ میں ان لیڈروں کی تحریروں کے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔

یہ بالکل بجا اور درست ہے کہ یہ نظریہ کہ تمام مذاہب سچے ہیں، یکسر باطل اور گمراہ کن ہے۔ لیکن صاحبِ مضمون نے (دانستہ یا نادانستہ) اُس بزرگوار کا نام نہیں لیا جس نے سب سے پہلے ہندوستان میں اس نظریہ کو عام کیا۔ ہندو لیڈروں نے تو اس کے تتبع میں یہ کچھ کہا تھا۔ یہ بزرگوار تھے مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)۔ انہوں نے اس نظریہ کو اپنی کسی تقریر یا ہنگامی تحریر میں پیش نہیں کیا تھا بلکہ اپنی مستقل تصنیف، ترجمان القرآن میں بڑی شرح وبسط سے درج کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

> قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔
>
> (ترجمان القرآن۔ سنہ ۱۹۳۷ء ایڈیشن۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۳)

اس سے ذرا پہلے انہوں نے کہا ہے کہ "اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے"۔ (ایضاً صفحہ ۲۱)

یہ تفسیر پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۳۱ء (یا سنہ ۱۹۳۲ء) میں شائع ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور تفسیر سورۂ فاتحہ کے متعلقہ حصہ کا (جس سے مذکورہ صدر اقتباسات دیئے گئے ہیں) ہندی میں ترجمہ کرکے اس کی عام اشاعت کی۔ جون سنہ ۱۹۴۱ء میں شولاپور میں "تمام مذاہب کی کانفرنس" منعقد ہوئی تھی جس کے صدر پنڈت سندر لال جی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں اس تفسیر کے ہندی ترجمہ کے اقتباسات مشرح وبسط سے پیش کرکے یہ ثابت کیا تھا کہ خود اسلام کی رُو سے، تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں۔ اس لئے کوئی مذہب اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ مجھے کسی دوسرے مذہب پر افضلیت حاصل ہے۔

جس وقت (سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں) مولانا آزاد کی یہ تفسیر شائع ہوئی ہے ان کے علم وفضل کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور کسی کو اس کی جرأت نہیں پڑتی تھی کہ ان کی تردید میں ایک لفظ بھی کہہ سکے۔ لیکن وہاں ایک خدا کا بندہ ایسا موجود تھا جو اسلام کے خلاف اس قسم کی کھلی ہوئی سازش کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے مولانا آزاد کی اس تفسیر پر مفصل تنقید لکھی اور ان کے پیش کردہ نظریہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ یہ تنقید، ہندوستان کے معروف علمی مجلہ معارف کی جنوری سنہ ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی اور اس سے وہاں کی علمی اور دینی فضا میں ارتعاش پیدا ہوگیا تھا۔ یہ خدا کا بندہ، جس نے اس وقت اس جرأت سے کام لیا، غلام احمد پرویز تھا۔ (جسے خیر سے "علمائے کرام" کافر قرار دے رہے ہیں!) ان کا یہ مقالہ، بعد ازاں (ضروری تفصیلات کے ساتھ) طلوعِ اسلام میں سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا اور اب ان کے مجموعہ مضامین میں شامل ہے۔

مولانا آزاد کے اس نظریہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے، مہاتما گاندھی نے (بھارت کے موجودہ صدر) ڈاکٹر ذاکر حسین

کی رفاقت سے) بچوں کے لئے ایک تعلیمی اسکیم مرتب کی جو "وارد ھا تعلیمی اسکیم" کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس اسکیم کی رُو سے بچوں کو یہی تعلیم دی جانی مقصود تھی کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں۔ اس نہایت خطرناک اسکیم کی مخالفت کی توفیق بھی طلوع اسلام کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کی اگست ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں اس اسکیم کے خلاف چالیس صفحات پر مشتمل ایک بھرپور مضمون شائع ہوا۔ اس نے ملک میں دھوم مچا دی۔ اس تنقید کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ الگ پمفلٹ کی شکل میں، چھ مختلف زبانوں میں، ہزارہا کی تعداد میں، شائع ہوا۔ نتیجہ یہ کہ وارد ھا کی اسکیم، معہ اس کے نصاب کے، غرقِ مئے ناب ہو گئی اور یوں مسلمانوں کی قوم اس عظیم خطرہ سے محفوظ ہو گئی۔

ہم نے یہ داستان، طلوع اسلام کے لئے کسی قسم کا (CREDIT) لینے کے مقصد سے نہیں دہرائی۔ اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اس باطل نظریہ کو ہندوستان میں پیش کس نے کیا تھا اور اس کے بعد وہاں اس سلسلہ میں کیا کچھ ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ نسل کو اس کا علم ہی نہیں کہ تقسیم سے پہلے ہمارے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا، اور یہ کچھ کن حضرات کی طرف سے ہوا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ طلوع اسلام کے اُس دور کے فائلوں سے اُس زمانہ کی تاریخ مرتب کر دی جائے تاکہ آنے والی نسلوں کو اپنے ماضی قریب سے کچھ تو واقفیت ہو)

(۰)

۸۔ خدا کا نام

وہ مؤذن تھا۔

اذان دینے والے چبوترے پر چڑھتا، تو کانوں میں انگلیاں دے کر منہ اوپر اٹھاتا — آنکھیں بند کر لیتا — رگیں پھلا کر پوری آواز سے اذان کے کلمات ادا کرتا — بیچ بیچ میں دم لینے کو منہ بند کرتا تو آنکھیں تھوڑی کھول لیتا۔

پچھلے کئی دنوں سے جب وہ آنکھیں کھولتا تو سامنے چبارے کی کھڑکی میں اُسے دوپٹے والا سر نظر آتا — کبھی سُرخ — کبھی سبز — کبھی پیازی — کبھی کنارے پر گوٹا بھی ہوتا — کبھی خوبصورتی سے چنا ہوتا۔

دقت یہ تھی کہ صرف سر کی چوٹی ہی نظر آتی جو دوپٹے کے کنارے سے ڈھکی ہوتی — بعض دفعہ وہ ڈھلک جاتا تو کبھی چمکیلے گندھے ہوئے اور اُلجھے ہوئے اور کبھی پریشان بال نظر آجاتے — بعض دفعہ مہندی لگی انگلیوں کی نازک چٹکی ڈھلکے ہوئے دوپٹے کو تادیبی انداز میں واپس ٹکانے لگتی۔

اس نے مولوی سے کہا کہ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ اذان کی آواز دور نہیں جاتی۔

اگلے جمعہ کو جماعت ختم ہوئی تو اُس نے جلدی جلدی سنتیں ادا کیں اور نمازیوں کے نکلنے سے پہلے دروازے میں تولیہ بچھا کر بیٹھ گیا۔

"دیئے جاؤ مسلمانو کچھ — اذان والا چبوترہ اونچا کرنا ہے — خدا کا نام دور تک پہنچانا ہے"۔

لوگ کھنکھن سکے پھینکتے گئے۔

(بشکریہ "نصرت" لاہور)

۹۔ اسلام کا احیاء ہو رہا ہے!

مغربی پاکستان صوبائی اسمبلی کے آخری دنوں کے ایک اجلاس میں، کچھ دلچسپ سوال و جواب اور تأسف انگیز انکشافات ہوئے۔ کسی رکن نے سوال کیا کہ کیا یہ واقعہ ہے کہ عرس (حضرت) مادھو لال حسین کے موقعہ پر (جسے عرفِ عامہ میں میلۂ چراغاں کہا جاتا ہے) محکمۂ اوقاف کے چیف، مسعود صاحب، بہ نفسِ نفیس، ناچنے والی پارٹی کی سربراہی فرما رہے تھے، اور (کیا یہ بھی واقعہ ہے کہ) حکومت، محکمہ اوقاف کے ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ رقص و سماع کی اس قسم کی محفلوں میں شرکت کیا کریں؟

اس کے جواب میں، وزیر تعلیم محترم خان محمد علی خان صاحب نے فرمایا کہ مسعود صاحب، رقص کی نہیں بلکہ رقص کرنے والوں کی سربراہی فرماتے ہوئے مزار تک تشریف لے گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ

> افسر مذکور نے ہمیشہ اپنے آپ کو عامۃ الناس کے زمرے میں سے سمجھا ہے (ان کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ MAN OF THE MASSES ہیں) اور اس طرح انہوں نے ایک ایسی بلند (NOBLE) مثال قائم کی ہے جس کی تقلید ان کے دیگر ہم منصب افسر مشکل کر سکتے ہیں۔

ہم محترم مسعود صاحب کی خدمت میں، بارگاہِ وزارت سے ایسی بے مثال سندِ امتیاز کی گرہ باری پر، ہدیہ صد تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔

اس قسم کے میلوں پر اس طرح گانے اور ناچنے والی پارٹیاں، بعد ازاں، بھنگ کے پیالے پیتی اور چرس کے "سوٹے" بھی لگایا کرتی ہیں۔ (بلکہ ان کا یہ بھنگڑا اکثر و بیشتر نتیجہ ہوتا ہے اسی بھنگ اور چرس کا)۔ محترم وزیر تعلیم نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ یہ "مردِ عوام" ان ناچنے والوں کی سربراہی فرماتے ہوئے جب مزار تک پہنچے ہیں، تو اس کے بعد انہوں نے "عوام" کے ان "مشاغلِ حسنہ" میں بھی شرکت فرمائی تھی یا نہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ ان کے اس "فلک سیر" سارٹیفکیٹ کے اہل اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جب وہ کلیتۃً عوامی ہو جائیں۔ اور کلیتۃً عوامی ہونے کے لئے تو عوام کی تمام حرکات میں شرکت ضروری ہوگی۔

سوال کے دوسرے حصے کے جواب میں، محترم وزیر تعلیم نے فرمایا کہ محکمۂ اوقاف اس قسم کی سماع کی محفلوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے (جن میں رقص و وجد کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں) اور اس محکمہ کے ملازمین کو ان محفلوں میں شرکت کی آزادی ہے۔ لیجئے!

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم!
جنید و شبلی و عطار ہم مست

دستورِ پاکستان میں یہ شق موجود ہے کہ یہاں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا اور اس مملکت کے اغراض و مقاصد میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ اس کا مقصود معاشرہ کو اسلامی قالب میں ڈھالنا ہے۔

کیا ہم محترم وزیر تعلیم سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ان تقاریب پر اس قسم کی حرکات (جنکی حوصلہ افزائی کے لئے خود محکمہ اوقاف کے چیف کو عوام کا ہم رنگ ہونا پڑتا ہے) قرآن کی کون سی آیت اور رسول اللہ کی کون سی سنت کے مطابق ہیں۔ اور وہ کون سا اسلام ہے جس کے قالب میں معاشرہ کو اس طرح ڈھالا جا رہا ہے؟

ہمارے معاشرہ میں خلافِ اسلام (اور باعثِ تذلیلِ انسانیت) حرکات کا وجود ہی کچھ کم تاسف انگیز نہ تھا جو اس پر اس قسم کے مدح و ستائش کے سارٹیفکیٹس کا بھی ورود شروع ہو گیا ـــــ دیکھئے، اس ابتدا کی انتہا کیا ہوتی ہے!

مسلمانوں کی تاریخ

کے متعلق تو آپ نے بہت سی کتابیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن خود اسلام کی تاریخ کیا ہے؟ یہ شروع میں کیسا تھا۔ پھر راستے میں اس پر کیا گذری۔ اس میں کس کس قسم کی آمیزش ہوئی اور بالآخر وہ کیا سے کیا بن گیا ـــ؟

اس قسم کی کتاب شاید آپ کی نظروں سے نہ گزری ہو ـــ مصر کے نامور مؤرخ

علامہ احمد امین

نے اس موضوع کو اپنی تحقیق کا مرکز قرار دیا اور ایک سلسلۂ کتب شائع کیا ـــــ اس سلسلہ کی پہلی کڑی

فجر الاسلام

ہے۔ ادارہ طلوع اسلام نے اس کا نہایت شگفتہ اردو ترجمہ دو حصوں میں شائع کیا ہے ـــــ قیمت: ہر حصہ چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز

کے نام خطوط

ہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے
ہا سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا
ییں سے اطمینان بخش جواب نہیں
نفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے
ناب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح
تا ہے خطوط کا انداز بڑا دلکش اور
ت نا ہے۔ عمدہ کاغذ مجلد دیدہ
دوسری و تیسری جلد
پے فی جلد

عہد آفریں کتابیں

سلسبیل

لیات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ
خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے سلسبیل انہی
ایسی مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف
گئے ہیں۔ ایسی کتابیں
وتی ہیں۔ کتابت طباعت
ت مجلد آٹھ روپے

ضمیمہ

اسے ضرور پڑھئے

حسب ذیل فہرست میں سے جو کتابیں آپ منگوانا چاہتے ہوں ان پر یہ نشان (✓) لگا دیں اور ٹکٹ چسپاں کئے بغیر یہ کارڈ حوالۂ ڈاک کر دیں اور کتابوں کی مجموعی قیمت میں سے کم از کم ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر یا بصورت ڈاک ٹکٹ بھیج دیں۔ آپ کو بقایا قیمت اور محصول ڈاک کا وی۔ پی آ جائے گا۔ لیکن اگر آپ کتابوں کی کل قیمت منی آرڈر کر دیں تو دس روپے یا اس سے زیادہ قیمت کے آرڈر کے لئے ڈاک خرچ (بذریعہ رجسٹرڈ پارسل) ہم اپنی طرف سے ادا کر دیں گے۔

اسلام کیا ہے ؟ (اعلیٰ) ۸ روپے
اسلام کیا ہے ؟ (سستا) ۴ ,,
سلسبیل ۸ ,,
قرآنی فیصلے (جلد اول) ۳/۲۵ ,,
قرآنی فیصلے (جلد دوم) ۳/۲۵ ,,
قرآنی فیصلے (جلد سوم) ۳ ,,
انسان نے کیا سوچا ؟ ۱۲ ,,
خدا اور سرمایہ دار (اعلیٰ) ۹ ,,
,, ,, ,, (سستا) ۵ ,,
پاکستان کا معمار اول ۳ ,,
قرآنی قوانین ۳ ,,
نظام ربوبیت ۴ ,,
بہار نو ۵ ,,
مقام حدیث ۶ ,,
عربی خود سیکھئے (نیا ایڈیشن) ۳/۵۰

سلیم کے نام خطوط (جلد اول) ۸ روپے
,, ,, (جلد دوم) ٦ ,,
,, ,, (جلد سوم) ۹ ,,
الفتنۃ الکبریٰ، طٰہٰ حسین مصری ٦ ,,
فجر الاسلام، احمد امین مصری
جلد اول ۴ ,,
جلد دوم ۴ ,,
لغات القرآن (جلد اول) ۱۵ ,,
,, (جلد دوم) ۱۵ ,,
,, (جلد سوم) ۱۵ ,,
,, (جلد چہارم) ۱۲ ,,
,, (پورا سیٹ) ۵۰ ,,
اسلامی معاشرت ۲ ,,
اسباب زوال امت ۱/۵۰ ,,
مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں ۳ ,,
جہاد ۲ ,,

نام و پورا پتہ ....
....
....

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

لاہور سے

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات اور دیگر نامور مصنفین کی تصنیفات

حاصل کرنے یا منگوانے کا پتہ:-

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور